www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انتساب!

اُس دیدۂ بینا کے نام

جو کسی بے دست و پا کو مل جائے!

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عرضِ مصنّف

سچ اور کہانیوں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ہر معاشرے میں سچ اپنی شان وشوکت کے ساتھ دیکھنے والی آنکھ کے لئے عیاں ہوتا ہے۔ جھوٹ کے بے شمار پردے اور مکاری کے پُرفریب جالے اِسے دُھندلا نہیں سکتے۔

قلم کار اسی سچ کو کاغذ پر اُتار دیتے ہیں کہ جھوٹوں کے معاشرے میں کچھ تو دل کا بوجھ ہلکا ہو، مگر جس معاشرے میں سچ بولنا جُرم ٹھہرے وہاں ہر ایک کی کوئی نہ کوئی مجبوری ہو ہی جاتی ہے۔

لکھاری بھی اِن بے نام اور ان دیکھی مجبوریوں کے بیچ نام بدل کر جگہیں تبدیل کر کے، جسم کوئی اور مستعار لے کر، اُسے لفظوں کی اُدھڑی پوشاک پہنا کر، سچائی وصداقت کی روح کو بیان کر ہی دیتا ہے۔

کسک بھی ایک ایسی ہی کارگزاری ہے۔ یہ تمام ''جھوٹی'' کہانیاں آپ کو ہمارے معاشرے میں مل ہی جائیں گی۔ صرف دیکھنے والی آنکھ چاہیئے۔ آنکھ صرف ترجمہ کرتی ہے اسے معنی دل پہناتا ہے اور دل کی اِس مہارت کے پیچھے کوئی نہ کوئی دوست ایسا ہوتا ہے جو ہر قدم پر رہنمائی کرتا ہے۔

میرے اِس دوست و محسن، ہمدم و راہبر کا نام مفتی محمد سعید خان ہے جن کی نوازش اور تربیت کی بدولت میں کچھ لکھنے کی جسارت کر لیتا ہوں۔ آنکھ اُن کی، دل اُن کا، الفاظ اُن کے، ہاتھ اُن کا، میرا کردار تو ایک قلم کا ہے، آپ ٹائپسٹ کہہ لیں تو میں اِس میں بھی خوش ہوں۔ جو باتیں پسند آئیں تو یہ میرے دوست کی مہربانی، جو غلطیاں ہوں وہ میری اپنی نالائقی۔ اپنی آراء ومشوروں سے ضرور نوازیئے گا۔

ذِیشان اُلحسن عثمانی

zusmani78@gmail.com

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	ادھورے مرد، مکمل عورتیں	8
2	ننگا بھکاری	11
3	لال بتی	15
4	تہذیب	18
5	قبولیت	19
6	جہاز کا سفر	23
7	تنہائی	27
8	تعلق	29
9	خوابوں کے سوداگر	32
10	لکھاری	35
11	پیری فقیری ڈاٹ کام	37
12	بڑا آدمی	39
13	عاجزی	41
14	گڑیا	44
15	تاریخ پاکستان	46
16	مچھلی مارکیٹ	52
17	مولوی صاحب	54
18	بنیاد	57
19	ماحولیاتی آلودگی	60
20	محبت	62

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
21	منگتا	66
22	ناجائز	68
23	تلاشِ گمشدہ	70
24	ڈریکولا	72
25	قرآن	74
26	بُت شکن	76
27	بیوٹی فُل لیگز	78
28	نیا راستہ	81
29	قاتل	83
30	جیت	87
31	بیلنس لائف	90
32	اعتماد	93
33	گلی کے بچے	95
34	گناہ	99
35	Mentor	102
36	امریکہ	104
37	انسان	107
38	من الربک	109
39	ڈِزابیلٹی	111

ادھورے مرد، مکمل عورتیں

ہمارے ملک کی بھی ایک ٹیگ لائن ہونی چاہئے۔ ''ادھورے لوگوں کا ملک''۔ ہم میں سے اکثر لوگ ادھورے ہوتے ہیں۔ ادھوری زندگی گزارتے ہیں، ادھورے رشتے نبھاتے ہیں، ادھورہ عشق کرتے ہیں، ادھورے کام کرتے ہیں، ادھورے خواب دیکھتے ہیں، ادھوری تعبیر پاتے ہیں، ادھورے گناہ کرتے ہیں، اور روتے پیٹتے ادھوری موت مرجاتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کا مرد بالخصوص ادھورا ہوتا ہے۔ ڈرا ہوا، سہما ہوا، بے حوصلہ، انجانے خوف کا اَسیر، اَن دیکھی زنجیروں کا قیدی، دردناک راہوں کا مسافر اور جھوٹی تمناؤں کا اُمیدوار۔ اس کے باوجود بے چارہ پورا عذاب سہتا ہے، پورا الزام اپنے سر لیتا ہے اور پوری ذمہ داری اُٹھاتا ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ عورت سلام کا جواب نہ دے اور مرد ہاتھ پکڑ لے۔ ہمارے مرد تو بہت ڈرپوک ہوتے ہیں۔ گناہ سے نہیں ڈرتے، گناہوں کے الزام سے ڈرتے ہیں۔ مگر جب بات آگے بڑھ جائے تو قصور سارے کا سارا بیچارے مرد پر اور عورت تو جیسے بے زبان، جذبات سے عاری کوئی موم کی مورتی ہو کہ پتہ ہی نہ چلا اور کب پگھل گئی۔

مردوں کے برعکس عورتیں نہ صرف پوری مکمل ہوتی ہیں، بلکہ مردوں کو مکمل کرنے اور ادھورہ چھوڑ جانے کا فن بھی جانتی ہیں۔ ان کے جذبات بھی مکمل ہوتے ہیں اور احساسات بھی، یہ محبت بھی مکمل کرتی ہیں اور نفرت بھی۔ عورتوں کے لئے محبت اور زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا جبکہ مرد محبت، زندگی، معاش، کام، ایمان سب کو الگ الگ خانوں میں رکھتا ہے۔

تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے ایک ہاتھ سے تو ماتم ہوتا ہے۔ یہ ادھورا مرد اپنی مردانگی کا ڈھنڈورا پیٹنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے آخر انہیں مکمل تو عورت کی ذات ہی کرتی ہے۔

جس معاشرے کو نقاب پوش خاتون کے جہیز اور ٹی شرٹ والے شوہر پر اعتراض نہیں اُسے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

داڑھی والے شخص کی بے پردہ عورت پر کمنٹس کا بھی کوئی حق نہیں۔

پیمانہ اگر صبر ہو تو ملکِ عزیز کے تمام مرد عورتیں اور عورتیں مرد قرار پائیں۔ اور سونے پہ سہاگہ جب ان ادھورے مردوں کی ''پوری'' غیرت جاگ جائے۔ اللہ کی پناہ۔

''آپ کی بیٹی بس اسٹاپ پر کھڑی باتیں کر رہی تھی''۔ ''آپ کی بہن نے برقع نہیں پہنا''، اور ''آپکی بیوی کی تصویر فیس بک پر کیوں؟'' اَجی آپ کی دینی غیرت کہاں مرگئی ہے ہمارے گھر ایسا ہوتا تو کشتے کے پشتے لگا دیتے۔

پتہ نہیں لوگ چاہتے کیا ہیں؟ یہی کہ غریب کا گھر برباد ہو جائے؟ بلاوجہ اپنی پاکیزگی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ سامنے والے کی عمر کیا ہے؟ کن مسائل سے گزر رہا ہے؟ کن سوچوں میں مگن ہے؟ کون سی جنگ سے ہار کے لوٹا ہے؟ کون سا محاذ ہے جس پہ جانا باقی ہے؟

عورت کو پاؤں کی جوتی بنا کر رکھو۔ کیوں بھائی، لے کر ہی کیوں آتے ہو کسی غریب کو اگر ایسے ہی اِرادے ہیں؟

مرد پیسہ لاتا ہے، کماتا ہے، تو؟ کیا وہ مالک ہو گیا۔ جسم کا، سوچ کا، اِرادوں کا، رُوح کا، گماں کا، اِمکان کا؟

مرد پیسے لاتا ہے مگر بچے پیسے نہیں کھاتے۔

مرد پیسے لاتا ہے مگر بچے پیسوں پہ نہیں سوتے۔

مرد پیسے لاتا ہے مگر پیسوں سے راحت نہیں ملتی۔ نہ خوشی ملتی ہے اور نہ اطمینان۔

اِن پیسوں کو کھانا عورت بناتی ہے۔ اِن پیسوں کو گھر، خوشی، اطمینان، سکون اور بستر عورت بناتی ہے۔

آپ کا نام نہاد ''مرد'' تو روز آفس سے گالیاں، غیبت، بہتان، جھوٹ، ظلم اور حسد کھا کے آتا ہے۔ یہ عورت ہی ہے جو اُسے تسکین دیتی ہے۔ کھانا کھلاتی ہے۔ دوبارہ سے جوڑتی ہے اور صبح ''مرد'' بنا کے بھیجتی ہے، جس اِسلام نے عورت کے اِستحصال کے درجنوں طریقے ختم کر کے اُسے نکاح کی حفاظت میں دیا۔ ہم مسلمان ایسے گئے گزرے کہ اسے جانور کے حقوق بھی نہ دیں۔ تف ہے ایسی مردانگی پر۔

یہ عورتیں بھی زندگی میں اعراب کی مانند ہوتی ہیں۔ کوئی کومہ، تو کوئی سیمی کولن، خوش نصیب

ہوتے ہیں وہ جن کے پاس کوئی فُل اسٹاپ ہو کہ اِس کے آجانے سے زندگی رُک جائے، تھوڑی دیر کو ہی سہی۔

سلام ہے اِس ادھورے لوگوں کے ملک کی مکمل عورتوں پر۔

جیتی رہیں اور خوش رہیں۔

☆.....☆.....☆

اُردو کُتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ننگا بھکاری

جمشید کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ ایک پاؤں زمین پر تو دوسرا آسمان پر۔ آج اُس کی تین سالہ کاوشوں کا نتیجہ شہر کے بیچ و بیچ دنیا سے دادِ ستائش وصول کر رہا تھا۔

بیس کڑور کی لاگت سے بننے والا نیو ورلڈ شاپنگ پلازہ آرکیٹکٹ اور ڈیزائن کا شاہکار تھا۔ جمشید نے آج جہاں ملک کی چیدہ چیدہ شخصیات کو تقریبِ رونمائی میں مدعو کیا تھا وہاں اپنے قریبی دوست عبداللہ کو بھی۔ اِس شرط کے ساتھ کہ وہ جب تک کچھ پوچھا نہ جائے، بولے گا نہیں۔

جمشید اور عبداللہ کا ساتھ یوں تو 25 سال پُرانا تھا۔ ساتھ پڑھے، ساتھ جوان ہوئے اور ہر ایک دکھ درد میں شریک۔ مگر دونوں کے مزاج اور طبیعت میں زمین آسمان کا فرق۔ جمشید جدی پُشتی رئیس تھا اور عبداللہ نے اپنی دنیا آپ بنائی تھی۔

جب سارے مہمان چلے گئے تو جمشید نے مسکراتے ہوئے فاخرانہ لہجے میں عبداللہ سے پوچھا۔ تم تو صاحبِ رائے ہو، کہو کیسا لگا یہ پراجیکٹ؟ یہ اِس ملک کو نئی شناخت دے گا۔ لوگ اس شہر کو اس پلازہ کے نام سے جانیں گے۔ لوگوں کو روزگار ملے گا، اچھا وقت کٹے گا، پارٹی، ڈانس، سینما سب کچھ تو ہے۔

عبداللہ کی آنکھیں جواب ڈھونڈنے میں کہیں دور کھو گئیں۔ جمشید کو بھی جلدی نہ تھی سو وہ اطمینان سے بڑی دلچسپی سے اپنے دوست کی گمشدگی کا مزہ لیتا رہا۔ عبداللہ تھوڑی دیر بعد گویا ہوا۔ کتنا مصنوعی لگ رہا ہے نا سب کچھ، ایک طرف بھوک و افلاس کے مارے لوگ، روٹی کو ترستے انسان، جھگیوں میں سسکتی زندگی تو دوسری طرف امارت کا یہ شاہکار۔

جمشید اگر تم آج مر گئے تو قبر میں اس پلازے کی کون سی اینٹ ہوگی جو کام آسکے؟ سینما، پارٹی ہال، شراب کی دکانیں؟

بس، بس مولوی صاحب، اپنے فتوے اپنے پاس رکھیں جو نہ کسی کو کاروبار دے سکیں، نہ معیارِ زندگی، نہ بھوک میں روٹی اور نہ ہی تن پہ کپڑا۔ میں ملازمت کے مواقع دے کر اپنے حصے کا اِسلام پورا کر رہا ہوں۔ جمشید نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

عبداللہ نے اپنی بات پھر سے جوڑی۔ کیا کوئی اِدارہ ایسا بنایا جا سکتا ہے جو نسلوں پر کام کرے؟ پڑھائی اور ہنر سکھائے؟ دھتکارے ہوؤں کی آبیاری کرے؟

عبداللہ چھوڑ ان باتوں کو، چل گھر چلتے ہیں۔ میں تجھے ڈراپ کر دیتا ہوں، یہ بکواس پھر کبھی سہی۔ آج تھک گیا ہوں۔ دونوں دوست ہنستے ہوئے اُٹھے اور جمشید کی نئی نویلی امپورٹڈ سپورٹس کار میں بیٹھ گئے۔

جیسے ہی کار پارکنگ گیراج سے باہر نکلی جمشید کی نظر سیدھے ہاتھ پر کونے پر کھڑے ایک برہنہ بھکاری پر پڑی۔ کوئی پچاس سال کا آدمی ننگ دھڑنگ روڑ پر سب کے سامنے کھڑا کھانا مانگ رہا تھا۔

جمشید کے منہ سے مغلظات کا ایک طوفان نکل پڑا۔ کمبخت، چرسی، موالی۔ منحوس کو آج ہی یہاں آ کے مرنا تھا میرے پلازہ کے سامنے۔ اگر لوگوں کا ڈر نہ ہوتا تو اِس حرام خور کو اِسی گاڑی کے نیچے روند دیتا۔ چرسی کہیں کا.....

عبداللہ نے ایک تفصیلی نظر بھکاری پر ڈالی۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف، سر نیچے جھکا ہوا، آس پاس کے ہجوم سے بے نیاز، ننگ دھڑنگ ایک ہی صدا لگا رہا تھا۔ بھوکا ہوں، بھوکا ہوں، بھوکا ہوں۔

عبداللہ نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا کہا۔ جمشید بھی بحث کے موڈ میں نہ تھا۔ عبداللہ کو اس بھکاری کے سامنے اُتار کر وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔

ہجوم میں کھڑے لوگ بھکاری کو طرح طرح کے طعنے دے رہے تھے۔ کوئی فحاشی کے الزام میں گرفتار کروانے کے لئے پولیس کو فون ملا رہا تھا تو کوئی لعن طعن کرتا ہوا اپنی بیوی کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتا گزر رہا تھا۔ نوجوانوں کا ایک جمِ غفیر تھا جو ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا تو کھلنڈروں کا ایک گروہ اپنے موبائل فونز سے اس بھکاری کی تصویریں کھینچ رہا تھا اور ویڈیوز بنا کر فیس بک پر شیئر کر رہا تھا۔

عبداللہ آگے بڑھا اپنی لمبی شرٹ اُتاری اور اُس بھکاری کو پہنا دی۔ اب وہ خود پتلون اور بنیان میں اور بھکاری شرٹ میں جس نے اُسے کسی نہ کسی طرح ڈھانپ ہی لیا تھا۔

لوگوں کی تصویروں کی تعداد دگنی ہو گئی۔ عبداللہ نے بھکاری کا ہاتھ پکڑا اور قریب ہی موجود

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایک ہیئر سیلون کے حمام میں چلا گیا۔تھوڑی سی نوک جھونک اور چار گنا زیادہ پیسوں کی ادائیگی کے بعد بھکاری کو نہانے کی اجازت مل گئی تو عبداللہ برابر والے شاپنگ مال سے کچھ کپڑے اور جوتے لے آیا۔نہلا دھلا کر، بالوں کی کٹنگ کروا کے، داڑھی کا خط بنوا کر، نئے اُجلے کپڑوں میں بھکاری خوشی کے مارے اپنے آپکو بھی پہچان نہیں پا رہا تھا۔

اب عبداللہ اِسے ایک اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھلا رہا تھا۔ وہ بھکاری کھانے پہ کچھ ایسا ٹوٹ پڑا تھا کہ جیسے صدیوں کا بھوکا ہو۔لوگ رُک رُک کر دیکھتے بھنویں چڑھاتے اور کچھ نہ کچھ بکتے ہوئے نکل جاتے۔عبداللہ سب سے بے نیاز یہ سوچ رہا تھا کہ حشر کے دن بھی تو ہم سب یونہی کھڑے ہوں گے رحم کی اُمید لگائے بیٹھے۔آدمی کو غسل خانے میں سوچنا ہی چاہیے کہ جسم زیادہ ننگا ہے یا اعمال۔اگر جسمانی برہنگی کا یہ احساس تو اعمال کی برہنگی کا کیوں نہیں؟

ان سوچوں کو بھکاری کی آواز نے توڑا۔صاحب جی آپ کا شکریہ۔دل خوش کر دیا آپ نے،اب میں جاؤں؟

نہیں۔کچھ سوال ہیں میرے پاس،عبداللہ نے جواب دیا۔

کپڑے کہاں گئے؟

صاحب جی،ایک ہی جوڑا تھا۔گھر بار تو ہے نہیں،نہر پر نہانے گیا تو کوئی پیچھے سے اُٹھا لے گیا۔درخت کے پیچھے گھنٹوں بیٹھا آنے جانے والوں کو آوازیں لگاتا رہا مگر سوائے طعنوں کے کچھ نہ ملا۔اگر لعن وطعن کو سی سکتا تو زندگی بھر کے کپڑے بن جاتے۔آج تیسرا دن ہے،اِسی حال میں تھا۔سوچتا تھا کہ شاید باری تعالیٰ نے رکھ چھوڑا ہے کہ لوگوں کی آزمائش بنوں کہ کون کیا کرتا ہے۔

انٹر پاس ہوں مگر نشے کی عادت نے یہ دن دِکھلایا۔آپ اچھے آدمی ہو، مالک آپ کو بہت دے گا۔

مالک کسے کہتے ہیں؟عبداللہ نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دوسرا سوال داغا۔

اَجی، وہ جس کی ملکیت ہووے ہے۔پھر وہ جیسا چاہے برتے۔بس قبول کر لے۔چاہے تو کام لے، چاہے تو زندگی بھر دیکھے بھی نہ۔چاہے تو بادشاہ بنا دے، چاہے تو مخلوق کے سامنے ننگا رکھ چھوڑے۔مالک وہ ہوتا ہے جس کی منشاء پر سوال نہیں ہوتا۔آپ تو پڑھے لکھے ہو بابو،آپ کو اتنا بھی نہیں پتہ؟

کون سا نشہ کرتے ہو؟عبداللہ نے پوچھا۔

جی چرس پیتا ہوں پانچ سو کی آتی ہے۔

اور اچھی والی؟عبداللہ نے اگلا سوال پوچھا۔

جی وہ تو امیر لوگوں کے امیر بچے پیتے ہیں۔وہ تین ہزار کی ایک ڈبی۔

چلو آج تمہیں چرس پلاتا ہوں۔عبداللہ نے بھکاری کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

بھکاری کی تو باچھیں کھل گئیں۔

جی وہ آپ شکل سے تو مولوی لگتے ہو مگر..... چلیں، مجھے کیا۔آپ نے دل خوش کر دیا۔کوئی دعا،کوئی آرزو، مالک کی قسم مرتے دم تک آپ کے لئے مانگتا رہوں گا۔

ایک شرط پر چرس ملے گی۔عبداللہ نے چرس خریدنے کے بعد ڈبیا آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

جی ہر شرط منظور ہے۔بھکاری نے بغیر توقف کے جواب دیا۔

اِسے پینے کے بعد میں تمہیں ہسپتال میں داخل کروا دوں گا جہاں نشے کا علاج ہوتا ہے۔ سارا خرچہ میرے ذِمہ۔

جی ضرور۔ بھکاری نے اسے مذاق سمجھتے ہوئے چرس کی ڈبیا اَچک لی۔عبداللہ اسے ہوش سے مدہوش ہو جانے کے عمل سے گزرتے دیکھتا رہا۔اور ساتھ میں روتا بھی رہا،آج اس کا وضو آنسوؤں سے ہی ہو گیا۔اس نے دعا کو ہاتھ اُٹھائے۔

''اے اللہ سائیں، چرس یہ پیئے اور نشہ مجھے چڑھے تیری محبت کا۔میں نے حج کے لئے پیسے جمع کر رکھے تھے آج اس کے علاج پہ لگا رہا ہوں۔تو اگلے سال ضرور بلا لینا۔اس سال یہ چرس کی ڈبی بدلے میں قبول کر۔حشر کے دن میرے اعمال کی برہنگی کو بھی چھپا دینا۔اے میرے مالک، اپنی منشاء پر چلنے کا ظرف دے۔قبول کر لے۔آسانی وعزت والا معاملہ کر۔تو اچھا ہے مجھے تجھ سے اچھے کی ہی اُمید ہے۔''

عبداللہ نے مدہوش بھکاری کو اُٹھا کر گاڑی میں ڈالا، چرس کو چوم کر ڈیش بورڈ میں رکھا اور ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

اگلے روز ملک بھر کے اخباروں میں بیس کروڑ کے نیو ورلڈ شاپنگ پلازہ کی تصویروں کے ساتھ ایک بے مایہ ننگے فقیر کی تصویر لوگوں کے اعمال کی دھجیاں اُڑا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لال بتی

لال بتی، سفید بتی، ہری بتی، پیلی بتی، پھر لال بتی اور مسلسل لال بتی۔ پھر لمبی خاموشی۔ پھر سب کی بتی اُن کے اپنے سر۔

انسانی زندگی میں رنگ برنگی بتیوں کا بڑا عمل دخل ہے۔ ٹریفک کے سگنل کی طرح کبھی کبھی زندگی لال بتی پر رک سی جاتی ہے۔ پیلی پر پھر سے انگڑائی لیتی ہے اور گرین پر چل پڑتی ہے۔ کوئی تو ہے جو سگنل چلا رہا ہے۔ سارے جذبات، سارے احساسات لگتا ہے کہ اپنا ایک رنگ رکھتے ہیں۔ لال بتی گناہ کی، ہری نیکی کی، پیلی توبہ کی، نیلی سوال کی، تو سفید زندگی ہے، کالی موت ہے۔ آسمانی آسمان کی۔ سُرمئی زمین کی اور ان دیکھی لوح وقلم کی۔

عبداللہ سوچا کرتا کہ کیسا لگتا اگر ہر گناہ پر انسانی سر میں ایک لال بتی جل جایا کرتی، اور ہری بتی نیکی پر۔ پورا دن چلتے پھرتے لال، ہرا، لال، ہرا ہوتا رہتا۔ کچھ ایسے بھی کہ ہرے بھرے رہتے تو کئی لعل ایسے کہ زندگی لال کر جائیں۔

نیکی اللہ سے قرب کی نشانی تو گناہ اس سے دوری کا نام۔ چھوٹے گناہ برقی لال قمقمے جو قطار کی شکل میں ہوں تو بڑوں کو مات کریں اور بڑے گناہ ہیلوجن کے ہزار وولٹ کے بلب جو گھر سمیت پورے محلے کو لال کر دیں۔

اور ایک اللہ، کیا کہنے، وہ اِس بات سے بھی بے نیاز کہ کتنے لال اور کتنے ہرے، بخشنے پر آئے تو لال کو ہروں میں شمار کر لے، نہ دیکھے تو ہرے لال رہ جائیں۔ چاہے تو بغیر توبہ کے کبیرہ گناہ بخش دے چاہے تو بلاوجہ ثواب دے دے۔ چاہے تو قبول کر کے جلا دے، چاہے تو بجھا دے۔ بندوں کی ہدایت کے اتنے راستے جتنی ہم سانسیں لیتے ہیں۔ کچھ نہیں پتہ بندہ سوئے کیا تو اُٹھے کیا، اور اُٹھے کیا تو سوئے کیا، کوئی کیسے کسی کو جانچنے کی ہمّت کرے۔ کچھ پر ایسا کرم کے خواب میں سوال

بھیج کر نیند سے اُٹھا دے، اور پھر کسی کو ذریعہ بنا کر خواب میں ہی رہنمائی کر دے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی گناہ کا مصمّم اِرادہ کرے، لال بتی جل جائے، پھر اس پر پوری قدرت رکھنے کے باوجود سوچے کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ چھوڑ دیتے ہیں اور گناہ کا اِرادہ ترک کر دے۔ تو اصولاً تو لال بتی بجھ جانی چاہئے تھی مگر عملاً ہری جل اُٹھتی ہے۔ ہے کوئی کرم کا حساب۔ پہلے گناہ کا سوچا اور اِرادہ کر لیا۔ پھر اسی گناہ کا سوچا اور اِرادہ بدل دیا۔ نیکی تو بیچاری بیچ میں کہیں سے آئی ہی نہیں اور بلب ہرا جل گیا۔ واہ بھئی واہ۔

اور لال بتی ٹرک کے پیچھے بھی تو ہوتی ہے جس کے پیچھے ہم بھاگتے ہیں۔ اِس ٹرک کا نام دُنیا ہے۔ فرشتے دُنیا کو دیکھتے ہونگے تو کتنی ساری لال بتیاں نظر آتی ہونگی۔ کہتے ہیں جو چیز اللہ کی یاد دلائے وہ بھی نیکی ہے، (ہری بتی) کوئی ایسے بھی خوش نصیب کہ آئینہ دیکھیں اور نیکی پا جائیں کہ اپنا چہرہ نظر آئے تو سارے گناہ یاد آ جائیں۔ پھر اللہ سائیں سے ڈر جائیں اور اللہ کا ڈر بھی تو ہری بتی ہے۔

اور جو غیر مسلم ہوتے ہیں یہ بھی تو اللہ کے ہی بندے ہیں بس اِنہیں پتہ نہیں ہوتا۔ اتنی سی بات ہے۔ اگر خالی پلاٹ کو پتہ نہ ہو کہ مالک کون ہے تو اِس سے مالک کی ملکیت تبدیل تھوڑا ہی ہو جاتی ہے۔ جس کا ہے اُسی کا رہے گا۔

اگر قبر میں بھی یہ بتیاں جل جائیں تو؟ لال بتی، ہری بتی؟

''ریڈ لائٹ'' ایریاز میں جانے والوں کو سوچنا ہی چاہئے کہ اگر ایک ریڈ لائٹ [لال بتی] اُن کی قبر میں بھی جل گئی تو کیا ہوگا؟ جہنم کی آگ کی لال بتی۔ اور جسم بیچنا بھی بڑی خیانت کی بات ہے۔ کبھی کوئی اُدھار لی ہوئی چیز بھی بیچی جاتی ہے؟ اور جو بیچ رہا ہے اسکی تو چلو شاید کوئی مجبوری ہو، جو خرید رہا ہے اسکی کونسی بتی جل گئی ہے؟ عجیب معاشرہ ہے۔ جو بک جائے، اپنے آپکو انسانیت کے اس معیار پر روند ڈالے، اسکی تضحیق اور جو خریدار ہے اسکی بتیاں کسی کو نظر نہیں آتیں؟ اور یوں تو ریڈ لائٹ ایریا والوں کے سر پر ایک لال بتی ہوگی۔ باقی تو شاید دو دو اُٹھائے پھریں ایک گناہ کی، دوسری منافقت کی۔

عبداللہ ریڈ لائٹ ایریا کے بیچ بنی واحد مسجد میں (جسکی لائٹ بھی اتفاقاً لال ہی تھیں) بیٹھا سوچ رہا تھا کہ ان دونوں عمارتوں کے لوگ صحیح کام نہیں کر رہے، ورنہ کسی ایک کا تو وجود ختم ہوتا، یا شاید یہ معاملہ یونہی چلتا ہوگا۔ پتہ نہیں کون سے اندھے ہوتے ہے جنہیں جسم بکتے نظر آتے ہیں،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عبداللہ کو تو ہر جگہ روح ہی بکتی نظر آتی ہے، ڈھیر ساری لال بتیوں کے بیچ۔

عبداللہ نے دعا کو ہاتھ اُٹھائے، اے مالک کُل، انہیں معاف کردے، اے روشنیوں کے مالک اللہ، بخش دے ان کو جن کی بتیاں لال ہوگئیں اور ان کو بھی جنہوں نے لال بتیوں پر ہرا پلاسٹک چڑھا رکھا تھا ریاکاری کا، اور اُن کا خیال رکھ جو ہری بتیاں ہیں، جن پر دنیا نے لال رنگ پھینک دیا ہے تہمت کا، بہتان کا۔ حشر میں ڈھانپ لینا اِن بتّیوں کو اُن کے صدقے جو تیرے نام پر خاک ہوئے اور اپنا رنگ کھو بیٹھے۔ جو جلتے بھی تیرے لئے ہیں، بجھتے بھی تیرے لئے ہیں۔ اپنے حبیب رسالت پناہ حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کے نور کے صدقے ہماری بتیاں ہری کردے۔

آمین

☆.....☆.....☆

تہذیب

میری بیوی مجھے جوتوں سے مارتی ہے

تہجّد پہ اٹھانے کے لئے

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قبولیت

ظفر اور مقبول اَپر اَتلی کے دو بھائی تھے۔ظفر کی پیدائش کے دو سال بعد ہی اس کا باپ مر گیا اور مقبول اپنے باپ کی موت کے کچھ ماہ بعد پیدا ہوا تو دوران زچگی ماں مر گئی۔یتیمی اور غریبی میں بیماریاں تو بس بہانہ ہوتی ہیں، اصل میں تو امیر روٹی کھاتے ہیں اور غریبوں کو روٹی کھا جاتی ہے۔ سو مقبول کی ماں بھی راہیٔ ملکِ عدم ہوئی۔

ہمارے معاشرے میں غریبی بذات خود ایک گالی ہے اوپر سے یتیم اور مسکین، دونوں بھائیوں کی خوب مٹی پلید ہوئی۔ایک دُور کے ماموں اپنے گاؤں لے گئے اور روتے دھوتے ظفر اور مقبول 7 اور 5 سال کے ہو گئے۔

آج ان کے دور پرے کے ماموں نے شہر میں انہیں ایک کوٹھی میں ملازم رکھوا دیا، مہینے کے مہینے آ کر وہ تنخواہ لے جایا کریں گے اور یہاں بچے مفت میں کھا پی لیں گے اور کام کا سلیقہ بھی سیکھیں گے۔

ظفر کی ڈیوٹی صاحب کی بلّی کی حفاظت پر لگی تو مقبول کی ڈیوٹی صاحب کے چھوٹے بیٹے کی دیکھ بھال پر جو بمشکل ساڑھے تین سال کا تھا۔مقبول ''چھوٹے صاحب'' کو رات بھر جُھولے میں گھماتا رہتا اور کچھ نہ کچھ کھلاتا رہتا کہ رونے کی آواز سے صاحب اور مالکن کی خلوت میں اثر نہ پڑے۔اور ستارے 5 سال کے کم سِن غلام کو دیکھ کر ہنس ہنس کے غائب ہوتے رہتے۔

صاحب جی کوئی بڑے گورنمنٹ آفسر تھے، شخصیت میں رچی فرعونیت اور طبیعت میں بھری کرختگی اتنی تھی کہ کوئی لفظ نہ بول سکے، دولت اتنی کہ پھاوڑوں کاٹے کم نہ ہو۔

دونوں بھائیوں کی تو جان جاتی تھی اگر صاحب کی نظر بھی پڑ جائے۔ایک دن ظفر سے غلطی ہوئی کہ بلّی کو دودھ ذرا گرم دے دیا، وہ اُچھل کر بھاگی تو صاحب جی نے دیکھ لیا اور کھولتے ہوئے دودھ کا برتن ظفر کے چہرے پر اُنڈیل دیا۔

مقبول رات بھر کپڑے سے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنے بھائی کے آبلے صاف کرتا رہا۔جس جسم پر پھول کی چھڑی نہ لگی تھی اس پر یہ دن بھی آنا تھا۔پتہ نہیں جانوروں کے حقوق کا خیال رکھنے والے انسانوں کو ڈسنا کب چھوڑیں گے؟ مقبول کی ڈیوٹی چھوٹے صاحب کی دیکھ بھال کی وجہ سے مالکن کے آس پاس ہی ہوتی، مالکن بھی غصے کی تیز تھیں، جسم کے اعضاء کی ساخت ایسی کہ ہنسی کی پوٹ مگر اپنے حسن پر اتنا زعم کہ شہزادیاں شرمائیں، وہ شاید بہری بھی تھیں کہ اپنے علاوہ کسی کی نہیں سنتی تھیں۔

آج رمضان کی ستائیسویں رات تھی، ہر ایک نے زرق برق لباس پہنے ہوئے تھے، صاحب جی شلوار قمیض میں گھوم کر مہمانوں کو افطار کے لئے بٹھا رہے تھے، اور برابر والی مسجد میں رَت جگے کی تیاریاں اور لاؤڈ اسپیکر کی ٹیسٹنگ جاری تھی۔دونوں بھائیوں کی حالت کام کر کر کے رڈّی ہو رہی تھی۔اُٹھتے جوتی بیٹھتے لات۔ان کی اتنی ہستی ہی کب تھی کہ کوئی اُن پر بھی رحم کرے۔دونوں بھائیوں کے دلوں کی گفتگو صاحب جی کی نغمہ سنجی میں دفن ہو گئی۔کیا مجال کسی کی کہ ایسی ایمان انگیز تقریب کو اُچٹا کر کچھ کہنے کی جُرأت کرے۔ایک مہمان نے عشاء کے بعد چپکے سے دونوں کا روزہ کھلوا دیا۔یہ کہنا مشکل ہے کہ ایسا انہوں نے نیکی کے شوق میں کیا یا کسی گناہ کی شرمندگی میں۔

مالکن نے مقبول کو آواز لگائی کہ وہ جلدی آ کر چھوٹے صاحب کا خیال رکھے تو وہ جلد نہا دھو کر رات کے وعظ کے لئے بن سنور جائیں۔

مقبول نے چھوٹے صاحب کو بہلانے کے لئے بلّی کا پنجرہ سامنے رکھ دیا۔بلّی آج صبح سے بند تھی مہمانوں کی وجہ سے، اس لیے بڑی خونخوار ہو رہی تھی۔چھوٹے صاحب نے بھی آج بلّی کو زِچ کرنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔کبھی دم کھینچتے تو کبھی مونچھوں کے بال توڑتے، کبھی آنکھ میں اُنگلی مارتے تو کبھی ٹانگ کھینچتے۔مقبول نے بارہا منع کیا مگر اس کی تو زندگی میں کوئی بات قبول نہ ہوئی جو آج ہوتی۔ جہالت کے کرشمے اور امارت کے زعم بیکار نہیں جاتے مگر نقّارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

بلّی بھی آخر بلّی تھی کہاں تک صبر کرتی۔کسی غریب کا بچہ تو تھی نہیں کہ زندگی کی ہر شرارت کا انتقام چپ سے لیتی، اس نے آخر چھوٹے صاحب کے چہرے پر پنجہ مار ہی دیا۔کچھ خراشیں اور ایک خون کی قلقاری چھوٹے صاحب کی چیخوں کے لئے کافی تھی۔مالکن جیسے تیسے بھاگ کر پہنچیں اور خون دیکھ کر تو ان کی جان ہی نکل گئی۔ایک ہاتھ سے چھوٹے صاحب کو سنبھالا تو دوسرے ہاتھ سے مقبول کا گریبان پکڑا۔وہ بے چارہ اس ناگہانی پر جیسے ساکت ہی ہو گیا تھا، مالکن نے گلا پھاڑ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پھاڑ کے چیخنا شروع کیا، ایک کِھلائی بھاگ کر آئی تو چھوٹے صاحب کو اس کے حوالے کیا اور بل پڑیں بے ماں کے بچے پر۔ بلّی کا پنجرہ اُٹھا کر منہ پر مارا تو ایک سلاخ کان کے آر پار ہوگئی، چہرے پہ اِتنے تھپڑ مارے کہ طباق سا چہرہ پیپی رہ گیا، گھر کے درودیوار تک حیران تھے کہ ایک ماں ہوکر پنا ماں کے بچے سے یہ سلوک کیونکر روا رکھا۔ اِسی اثناء میں بڑے صاحب بھی آ گئے۔ ظفر بھی چیخ وپکار سُن کے آ پہنچا مگر اس کی اتنی ہمت کہاں کہ وہ کسی کا ہاتھ روک سکے۔ جو عمر کارٹون دیکھنے کی ہوتی ہے اس میں جلاّد دیکھ رہا تھا۔ صاحب جی تھے تو پچاس کے آس پاس مگر بیگم کی شکایتوں پر جنون طاری ہو گیا، کچھ لوگ ویسے بھی بڑھاپے میں پہنچ کر جوان ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے گھوڑوں کو مارنے والی بید نکالی اور طاقت کی مشق مقبول کی ننھی کمر پر کرنے لگے۔ مار مار کے خونم خون کر دیا اور گالیوں کی وہ تقریر کہ شبِ قدر بھی حیران رہ گئی ہوگی۔ جب صاحب جی کے ہاتھ رُکے تو مقبول تقریباً مر چکا تھا، انہوں نے اُسے اُٹھا کر دوسری منزل سے نیچے پھینک دیا۔

ظفر بھاگتا ہوا گیا اور بہ مشکل تمام مقبول کو اُٹھا کر گھر کے باہر مسجد کے پچھواڑے بنے قبرستان میں چلا گیا۔

صاحب جی اور مالکن چھوٹے صاحب کی مرہم پٹی اور دلجوئی میں لگے، اِدھر مولوی صاحب نے مائیک کا گریبان چاک کیا، مریدوں پر سکّہ جمانے کے لئے شبِ قدر کی وہ وہ کرامات بیان کرنے لگے کہ بیان سن کر ہی بخشے جائیں گے۔ اپنی کرامات کا وہ ذکر کہ اللہ سائیں کے سانجھی اور حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی قریبی عزیز معلوم ہوں۔

مقبول اپنے بھائی کے ہمراہ ایک بوسیدہ قبر پر لیٹا اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا، اور قریب میں نیم کے درخت کے وہ نمک خوار پتّے جنہیں ظفر کبھی کبھار پانی دے دیتا، اپنی بے بسی پر ماتم کرتے ہوئے شاخوں کو پھیلا رہے تھے کہ حشر میں ان بچوں پر سایہ کرنے والوں میں لکھے جاسکیں۔

ظفر نے آسمان کی طرف دیکھا اور دعا کو ہاتھ اُٹھائے:

یا ذوالجلال والاکرام، یا رب العالمین، اے رات کی تاریکی میں پہاڑوں پر چلنے والی چیونٹی کے پاؤں کی آواز سننے والے سمیع وبصیر، ایک گناہگار بندہ، ایک نابکار غلام، تیری سرکار میں تیرے دربار میں تیرے کرم کا طالب، تیرے رحم کا ملتجی، ذلیل وخوار ہو گیا ہے۔ زمین وآسمان کے مالک، جنگل وبیابان کے بادشاہ، انسانوں وحیوان کے رزاق، شبِ قدر کے رب، کوہ ودریا کے اَنداتا، تیرا نام بڑا، تیرے کام بھلے، تیرا رحم وسیع، تیرا کرم عمیق، میری فریاد کو پہنچ، میری دہائی کو سُن، میری

تڑپ کو آ، میرے صبر کو تول، میری التجا کو سُن، میری پکار کو قبول کر، خشکی وتری کے شہنشاہ میری عزت بچا، میری آبرو رکھ، تو غفور ورحیم ہے تو علیم وخبیر ہے۔ پناہ دے کُل جہانوں کے سرتاج، پناہ دے۔ بے شک تیری پناہ بڑی چیز ہے۔ دنیا کی پریشانی سے بچا۔ آفت ناگہانی سے بچا۔ بھوک کے عذاب سے بچا۔ تکلیف کی انتہا سے بچا۔ مصیبت کی ابتداء سے بچا، آنکھوں کو چین دے، روح میں سکون دے، عمر میں برکت دے، مجھے میرے بھائی کا بدلہ دے، کسی کی نہ سنیو میرے مالک، پورے ملک میں نہ سنیو، اس مقبول کی زندگی میں کوئی قبول نہ ہوئی۔ آج اس کی موت پر قبول کر لے۔ یہ لاش اے مالکِ پروردگار، اے دھتکارے ہوؤں کے رب، اے لاوارثوں کے وارث، اے یتیموں کے ملجا، اے بے نصیبوں کے پالنہار، یا ذوالجلالِ والاکرام میں تمام لوگوں کی دعاؤں اور تیرے بیچ رکھتا ہوں۔ یا اللہ یہ غریبوں کو کھانا نہیں دیتے، جاہلوں کو تعلیم نہیں دیتے، یتیموں کا خیال نہیں رکھتے، مسکینوں سے شفقت سے پیش نہیں آتے، ان کی ایک نہ سنیو میرے مالک تجھے تیری خُدائی کا واسطہ، وسیلہ تیرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ تُو سُن لے میرے مالک، تُو تو وہیں تھا، سب دیکھ رہا تھا، بلّی جتنا بھی نصیب نہیں ہمارا۔ آج نہ سنیو، کسی کی نہ سنیو، تیری منتیں کرتا ہوں۔ تیرے پاؤں پڑتا ہوں۔ تیرے سامنے ناک رگڑتا ہوں۔ اِس پھٹی جھولی کا واسطہ، اِس بھوکے پیٹ کا واسطہ، اِس نکلتی ہوئی جان کا صدقہ، قبول کر لے، تجھے تیری اُن صفات کا واسطہ جن کا مجھے پتہ کوئی نہیں آج مان لے۔

مقبول کی زبان سے ایک نحیف آمین نکلی اور اُس کی روح اس بے قرار بدن سے پرواز کر کے اس کے پاس چلی گئی جو سب کو قرار دیتا ہے۔

ظفر نے اس کے ماتھے پر آخری بوسہ دیا اور مسجد کی طرف چل پڑا۔ تہجد کا وقت تھا، مولوی صاحب بیان لپیٹ رہے تھے، کہنے لگے، حضرات یقین جانیئے، اللہ نے سُن لی، آپ سب کو آپ کی مرادیں بس مل گئیں، گناہوں سے ایسے پاک ہوئے کہ ابھی جنے گئے ہو۔ خوش وخرم گھر جائیں اور سحری کھائیں۔

مسجد کی آخری صف میں بیٹھے ہوئے ظفر کے چہرے پر نجانے کہاں سے مسکراہٹ آ گئی اور اس نے زور سے کہا۔

آمین!

☆.....☆.....☆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جہاز کا سفر

جان ایف کینڈی ایئرپورٹ پر مسافروں کی ایک لمبی لائن میں لگا عبداللہ اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا، بھات بھات کے لہجے اور طرح طرح کے لوگ۔ سُننا عبداللہ کا پسندیدہ مشغلہ تھا، لوگوں کی سنے اور کوئی آس پاس نہ ہو تو اپنے دل کی سُنے۔ وہ خاموشی کو گفتگو کی تکمیل کہتا تھا۔ ہر شخص لائن میں اپنی پوزیشن پر جم کر کھڑا تھا کہ جیسے عمر اسی اِسپاٹ پر بِتا دینی ہے۔ کچھ لوگوں کے لئے قطار میں کھڑا ہونا ہی کامیابی ہے اور ایک عبداللہ جو منزل پر پہنچ کر بھی بے چین رہتا۔ کچھ مسافر منزل پر پہنچ کر کھو جاتے ہیں اور منزل انہیں ڈھونڈتی رہتی ہے تو کچھ راستے میں کھو جاتے ہیں اور منزل ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ پتہ نہیں دونوں میں سے کامیاب کون ہوتا ہے۔ لوگوں کی طرح ہر ملک کی شہریت کی بھی ایک پرسنیلٹی ہوتی ہے جو وہاں کے کلچر، مذہب، رسم ورواج اور معاشرتی اقدار کی ترجمان ہوتی ہے۔ آپ جیسے جیسے مشرق سے مغرب کا سفر کرتے ہیں انسانیت ریفائن ہوتی چلی جاتی ہے، دھکّم پیل کی جگہ مہذب لوگ، انتشار کی جگہ پُرسکون قطار اور چہروں پر کوفت اور ڈر کی جگہ مسکراہٹ، جیسے جیسے سفر مغرب سے مشرق کی طرف ہوتا ہے انسانیت واپس تنزلی کی راہ پکڑتی ہے۔

مسافروں کی لائن میں ایک 80 سالہ بوڑھے بابا بھی تھے جو نیویارک سے انڈیا واپس جا رہے تھے۔ رنگ برنگی پوشاکوں اور گورے گورے جسموں کے درمیان وہ گاڑھے میں کمخواب اور لٹھے میں ململ کا پیوند معلوم ہو رہے تھے۔ وہ خود آگے بڑھے اور عبداللہ کو اپنی کتھا سنانے لگے، آہ کتنا کال ہے ہماری دنیا میں سننے والوں کا، وہ بھی شاید عبداللہ کے پاس اس لئے آ گئے کہ وہ مجمع میں واحد شخص تھا جو آنکھیں بند کئے خاموش کھڑا تھا کہ باقی سب لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

بابا گویا ہوئے: ''میں اپنے بیٹے سے ملنے آیا تھا حیدرآباد سے، وہ یہاں ڈاکٹر ہے، کچھ دن تو گھر میں رکھا پھر کہنے لگا کہ آپ کی کھانسی سے میری ولایتی بیگم کو اُلجھن ہوتی ہے، تو مجھے ایک ہوٹل

میں شفٹ کر دیا، پہلے تو ہفتے میں 3,4 بار ملنے آتا تھا مگر آج 22 دن ہوئے ملنے نہ آیا، بے چارہ بہت کام کرتا ہے مصروف ہو گیا ہوگا، ٹیکسی بھیج دی تھی ایئرپورٹ ڈراپ کرنے کے لئے، بس ایک بار ملاقات ہو جاتی تو اچھا تھا، پھر زندگی رہے نہ رہے۔''

عبداللہ نے درد کی چبھن اپنی ریڑھ کی ہڈی میں محسوس کرتے ہوئے بات بدلی، اچھا بزرگوار آپ کے پاس کوئی سامان نہیں ہے؟ اس لدے پھندے ہجوم میں تعجب کی بات ہے۔ بس بیٹا، کیا بتاؤں، بیوی نے کہا بیٹے کے پاس جا رہے ہو کچھ لے کر جانے کی ضرورت نہیں، وہ بڑا آدمی ہے خیال رکھے گا، یہ ماؤں میں بیٹوں کی سخاوت کا سودا کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے، جس سے سُنا، جو سُنا ایمان لے آئیں۔ بیٹا، جس کے ساتھ ہمیشہ سے سلوک کیا اس کے آگے ہاتھ پھیلانے کو دل نہیں چاہتا۔ مجھ سے کچھ مانگا نہ گیا، اُس نے کچھ دیا نہیں۔ ویسے بھی 80 سال کی عمر میں خدا کے سوا کون سنتا ہے۔ نہ اولاد، نہ لوگ، نہ ہی اپنے جسم کے اعضاء، نفس بھی گناہ کا بولیں نا! تو جسم کہتا ہے بڑے میاں چپ رہو، اب ہمت نہیں ہے۔ زندگی روز مارتی ہے بیٹا، موت تو ایک بار مارے گی۔

عبداللہ نے اپنی آنکھ صاف کرتے ہوئے منہ دوسری جانب موڑ لیا اور چپکے سے کچھ سو ڈالر نکال کر بابا کے ہاتھ پر رکھ دیئے کہ جائیں تو بڑی بی کو دے دینا کہنا کہ بیٹے نے بھیجے ہیں۔

لائن تھوڑی سی آگے کھسکی تو عبداللہ کے پیچھے ایک خاتون نے جگہ بنائی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ٹرالی میں رکھے بیگ زیادہ تھے یا ان کے بچوں کی تعداد۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ دو چار دن کی آئی لگائی نہ تھی، 15 برس کی گھر بیٹھن بریٹن، بیاہی، تنہائی 7 بچوں کی ماں تھیں۔ امریکہ میں رہتی تھیں اور پاکستان اپنے میکے جا رہی تھیں۔

ابھی عبداللہ ان خاتون کے شکنجے سے نکل بھی نہ پایا تھا کہ یورپین لڑکیوں کا ایک گروپ برابر والی لائن میں آدھمکا۔ اس کی پوری لائن کے منہ اسی طرف ہو گئے، عورتوں نے منہ بنا کے رُخ بدل لیا تو مردوں نے عینک کے شیشے صاف کر کے بالوں پر ہاتھ لگا کے، بیوی بچوں سے نادانستہ کچھ قدم کا فاصلہ کر لیا۔

گروپ کیا تھا سفید ٹانگوں کا مجموعہ تھا اور گریبان کے چاک اتنے گہرے کہ سمجھ نہ آتی تھی کہ نمائش کس کی ہے کپڑوں کی یا جسموں کی۔ کسی نے بیوی کے ڈر سے نظریں نیچی کر لیں تو کسی نے لوگوں کے خوف سے، مگر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ بار بار ہر ایک سے اُٹھ رہی تھی، سفیدی اور گوشت سے بھرے جسم دل کو کچوکے لگا رہے تھے۔ خدائی جنت کے دعوے اُس شیطانی جنت کے مقابلے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں جو نظروں کے سامنے جلوہ گر تھی کچھ مؤثر ثابت نہ ہوئے۔

کیا عجب بات ہے کہ شیطانی ٹولہ انسانی نفس پرستی کے تمام اسباب نقد فراہم کر رہا ہو اور بندہ خدائی فوجداروں کی سن لے جو زندگی کے ہر لطف کی دستیابی موت سے شروع کرتے ہیں۔

صحرا کے پیاسے کو پانی کے پیالے سے یہ کہہ کر جدا کرنا کہ زہر آلود ہے اور منزلِ مقصود پر حوریں پانی کے چشموں پر انتظار کر رہی ہیں بڑا مشکل کام ہے۔ عبداللہ نے بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں مگر آنکھ بند کرتے ہی نفس کی آنکھ کھل گئی تو اس نے گھبرا کر پھر آنکھیں کھول دیں۔ ابتک اس کی باری آ چکی تھی، بورڈنگ پاس لیا اور جہاز میں سوار ہو گیا۔ اسے اپنی پسندیدہ ونڈو سیٹ ملی تھی، رن وے پر بھاگتے جہاز کو دیکھتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ جہاز کا سفر زندگی سے کتنا قریب تر ہے۔ سب لوگوں کی منزل ایک ہی ہے لیکن اس کے باوجود سب کی اُمنگیں، احساسات، جذبات اور ارادے الگ، جہاز آسمان کی طرف بلند ہوا، لوگ چھوٹے ہوتے چلے گئے، بلڈنگیں چھوٹی ہو گئیں، گاڑیاں چھوٹی ہو گئیں اور پھر بادل آ گئے اور شہر اور اسکی رونقیں سب سمٹ گئیں۔ ایسے کہ جیسے دریا کوزہ میں بند ہو جاتا ہے۔ عبداللہ سوچنے لگا کہ عُجب کے ماروں کو جہاز کا سفر ضرور کرنا چاہئے، اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ جب اللہ سائیں کائنات کو دیکھتے ہوں گے تو اس میں دنیا ذرّہ کے برابر بھی نہیں ہو گی، اس میں ایک چھوٹا سا ملک، ایک اور چھوٹا سا دارالحکومت اور ایک نظر نہ آنے والا انسان کتنا مضحکہ خیز منظر ہوتا ہو گا جب وہ خدائی کا دعویٰ کرے، اِسلام کو مٹانے کے منصوبے بنائے، یا ظلم کرے اور سمجھے اس کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں۔ عادی ظالموں کے اس ملک میں جہاز کا سفر لازمی قرار دے دینا چاہئے۔

عبداللہ کی سوچوں کو ایئر ہوسٹس کی آواز نے توڑا، کھانا سرو کیا جا رہا تھا۔ عبداللہ سوچنے لگا کہ عزت و احترام کے ساتھ کھانا بھی بے شک اللہ کی بڑی نعمت ہے، کتنے ہی لوگ ہیں جو اس کھانے پر روز ذلیل ہوتے ہیں، قطار میں لگتے ہیں، لنگر جاتے ہیں یا کھانے کے انتظار میں بھوکے ہی رہ جاتے ہیں اور کتنی عجیب بات ہے کہ بندہ آسمانوں میں رزق کھاتا ہے۔ ہوائی میزبان اتنے اچھے ہوتے ہیں تو وہ میزبان کتنے اچھے ہوں گے جو اللہ مقرر کرے گا۔ عبداللہ کی آنکھیں شکر میں نم ہوتی چلی گئیں اور گوری ٹانگیں دِیدوں سے دُھلتی گئیں۔

جہاز میں سب سو چکے تھے، انڈیا والے بابا، پاکستان والی بیگم صاحبہ اور یورپ کی لڑکیاں، سب سو رہے تھے، محمود و ایاز سب برابر تھے، اگر کچھ ہو جائے تو سب کا انجام ایک سا ہو گا، قبر میں

بھی سب سوئے ہوں گے مگر سب کا انجام مختلف ہو گا، عبداللہ نے جھرجھری لی۔

اتنے میں ایک بچے کی رونے کی آواز نے ماحول میں صُور پھونکا۔ بہت سے لوگ نیند سے اُٹھ گئے اور دل ہی دل میں معصوم بچے اور اس کی ماں کو کوسنے لگے۔ عبداللہ نے بچے کے لئے دعا مانگی تو ایک ایک کر کے سارے رونے لگے، عبداللہ مسکراتے ہوئے سب کو دعا دیتا چلا گیا، بے شک دعا بھی ایک رزق ہے جو ہر بندے کو اس کے نصیب سے ملتا ہے۔

جہاز کی آخری سیٹوں پر ایک 30 سالہ نوجوان بیٹھا ہوا تھا، اُسے شاید کوئی بیماری تھی، رعشہ بھی تھا، وہ مسلسل ہل رہا تھا اور ہر 10 سیکنڈ بعد اس کے منہ سے ایک عجیب اور زوردار آواز نکلتی جس پر اس کا کنٹرول کوئی نہیں تھا، مسافروں نے لڑ لڑ کر ایئر ہوسٹس سے اپنی سیٹیں آگے کروائیں کہ اس مصیبت سے جان چُھوٹے۔

عبداللہ سوچنے لگا کہ اگر اللہ ہر انسان کو پروگرام کر دیتا کہ ہر 10 سیکنڈ میں اللہ بولنا ہے ورنہ اسی طرح مر جاؤ گے جیسے سانس نہ لینے سے مر جاتے ہو تو بندہ کیا کر لیتا، عبداللہ کو خون کی رفتار بڑھتی محسوس ہوئی جیسے دل کہہ رہا ہوں لا الہ الا اللہ۔ الگ الگ اِسٹاپ آتے گئے اور مسافر بدلتے چلے گئے، انڈیا والے بابا، یورپ کی لڑکیاں سب اپنی اپنی منزل پر اُتر گئے۔

جہاز نے زمین کی طرف سفر شروع کیا، بے شک ہر شئے نے زمین میں ہی جانا ہے۔ اسلام آباد ایئر پورٹ پر تمام مہذب لوگوں کی قلعی کھُل گئی، ہٹو بچو کا شور، سیکورٹی، پروٹوکول، عبداللہ کو لگا کہ لگیج بیلٹ پر سامان نہیں شیطانی اقدار آ رہی ہوں جو ہر بندہ جھپٹ کر اُٹھا رہا ہو، تکبر کا بیگ، رعونت کا ہینڈ کیری، تعصب کا اسٹالر، نفرت کی پیٹی، دکھاوے کا بستہ، اور فریب کا بکسہ۔

عبداللہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی، وہ سوچنے لگا کہ جو اِسلام رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے وہ شاید دنیا میں exist کرتا بھی ہے یا نہیں، پتہ نہیں کہاں ملے گا۔

مسلمانوں میں تو نہیں ملتا، افریقہ کی کسی قبیلے میں ہو تو ہو۔

عبداللہ نے بندگی اور درگزر کا بیگ اُٹھایا اور نکل پڑا مسلمانوں کو ڈھونڈنے۔

☆.....☆.....☆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تنہائی

تنہائی کی نعمت کا اندازہ کچھ لوگ ہی کر پاتے ہیں۔ یہ وہ دودھاری تلوار ہے جس نے کچھ کو بنا دیا اور سینکڑوں ہزاروں کو مٹا ڈالا۔ ہم میں سے جو مصروف ہیں انھیں تنہائی کا وقت ہی نہیں ملتا اور جو بے کار ہیں وہ اپنی تنہائیاں مصروفیت کے مشاغل سوچنے میں برباد کر دیتے ہیں۔ تنہائی کو کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دینا چاہئے۔

اگر پتہ لگ جائے کہ تنہائی کتنی بڑی نعمت ہے تو لوگ اسے بھیک میں مانگا کریں۔ تنہائی اپنے آپ سے ملاقات کو کہتے ہیں۔ جب ساری ملاقاتیں تمام ہوئیں، سارے غبار چھٹ گئے، ہجوم گھر کو گئے، منزلیں مل گئیں، ہم سفر کھو گئے، تب آدمی اپنے آپ سے ملتا ہے اور اسے تنہائی کہتے ہیں۔ منزلوں کی کھوج اصل ہے انکا ملنا نہیں کہ اگر وہ مل جائیں تو سب کچھ بے معنی رہ جاتا ہے خود منزل بھی۔

جب آپ لوگوں سے ملتے ہیں تو وہ آپکو کنزیوم کرتے ہیں، آپکو تنہائی میں اپنے رب سے کنیکٹ ہونا ہی پڑتا ہے تاکہ انرجی بحال ہو۔ تنہائی آپکو اپنا آپ دکھاتی ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں شکل نہیں کردار نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں خاموشی شور مچاتی ہے، سنّاٹے باتیں کرتے ہیں اور آپکے تخیل کو پسینہ آجاتا ہے جسے ہم آنسو کہتے ہیں۔

تنہائی طلب بھی تو ہے جو توفیق کو کھینچتی ہے۔ اعمال کا اثر شخصیت پر پڑتا ہی ہے۔ میرے ایک دوست کہتے ہیں کہ اللہ کی معرفت حرام ہے اس شخص پر جس کی تنہائی پاک نہ ہو۔ جتنے محترم و معتبر آپ لوگوں میں ہیں آپکی تنہائی کو کم از کم سو گنا زیادہ محترم و معتبر ہونا چاہئے۔ یہ تنہائی ہی ہے جو شخصیت میں وزن پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ محترم ہے تو نیکیوں کی توفیق کھینچ لائے گی اور اگر برباد گئی تو گناہوں کی توفیق بھی مل ہی جائے گی۔

تنہائی پیاس بھی تو ہے جو پانی کو زندگی کا جواز بخشتی ہے، جس دن پیاس پانی سے بے نیاز ہو جائے اور پانی پیاس کو ترسے تو طلب کربلا بن جاتی ہے اور یزید کی نسل مٹا دیتی ہے۔ یہ پیاس قائم رہنی چاہئے کہ بہت سوں کو اسکے صدقے رزق ملتا ہے۔

اور تنہائی ضد بھی تو ہے، اس میں آپ جو کرتے ہیں اسکا الٹ زندگی میں آپکو ملتا ہے۔ سالوں رونے کے بعد لوگوں کو ہنسانے، انکے دکھ درد بانٹنے کا ہنر عطا ہوتا ہے۔ جتنا آپ تنہائی میں روتے ہیں زندگی اتنی ہی مسکراتی چلی جاتی ہے۔ تنہائی میں اپنے آپکو مٹا دینے والے دنیا میں ممتاز ٹھہرے۔ تنہائی میں مالک کو دل دینے سے پوری کائنات کے دل آپکی طرف کھینچتے چلے جاتے ہیں اور تنہائی میں شرمندگی کا حساب، بندگی کا امتحان پاس کرا دیتا ہے۔

اپنے آپکو تولنے، پرکھنے، تڑپنے اور پھڑکنے کا اعجاز بھی تنہائی ہی کا مرہون منّت ہے۔ نصیبوں کی ایذا رسانیاں تنہائی کی گریہ وزاری سے ہی دور ہوتی ہیں اور یہ تنہائی ہی ہے جو تقدیر کا مقدّر سنوار دیتی ہے۔

اسکی قدر کریں، برکت کے معنی سمجھ آجائیں گے۔

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تعلق

انسانی زندگی میں سب سے زیادہ پیش آنے والا معاملہ تعلق ہوتا ہے۔ازل سے ابد تک، گود سے لحد تک، بچپنے سے لڑکپن اور جوانی سے بڑھاپے تک اس کا دورانیہ چلتا ہی رہتا ہے۔اَن دیکھے احساسات کی مالا، انجانے خوف کی کہانی، زندگی تیاگنے کا کارن، دنیا لٹا دینے کی داستان، رشتوں کو روند دینے کی آپ بیتی، اور نیک نامی کا سائبان، سب اسی ایک لفظ سے ہی تو شروع ہوتے ہیں۔

تعلق کی اتنی قسمیں ہیں جتنے انسانی احساسات، یہ پاک بھی ہوتا ہے اور ناپاک بھی، محترم بھی اور نامعتبر بھی، جائز بھی اور ناجائز بھی، جھوٹا بھی اور سچا بھی، دل کے لئے بھی اور دکھاوے کے لئے بھی، دین کے لئے بھی دنیا کے لئے بھی، خالق کے لئے بھی اور مخلوق کے لئے بھی، رونے کے لئے بھی، ہنسنے کے لئے بھی۔

ان کا وقفہ طویل بھی ہوتا ہے اور مختصر بھی۔ماں کی گود سے شروع ہونے والا تعلق قبر کے بعد حشر تک قائم رہتا ہے۔مالی منفعت کی خاطر بنایا گیا تعلق خسارے کی پہلی چوٹ پر ٹوٹ جاتا ہے۔

تعلق یک طرفہ بھی ہوتا ہے اور دوطرفہ بھی، سیانے یک طرفہ تعلق کو محبت اور دوطرفہ کو بزنس کہتے ہیں۔

کچھ لوگ تعلق کے بیوپاری بھی ہوتے ہیں اور جوڑنے توڑنے کا کام کرتے ہیں۔تو کچھ لوگ تمام عمر اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی آ کے ان سے بھی تعلق جوڑے۔کسی کا مرتبہ ایسا بلند کہ ایک دنیا تعلق جوڑنا چاہے اور کوئی مفلوک الحال ایسا کہ تعلق والے بھی لاتعلق ہو جائیں۔

تعلق کسوٹی بھی تو ہوتا ہے، رشتوں کی، جذبات کی، جو اچھے برے وقت میں اپنی مضبوطی کو ناپتا ہے۔تعلق کسی کو بناڈالتا ہے تو کسی کو برباد کر دیتا ہے اور کوئی زندگی بھر کسی در پہ بیٹھا تعلق کی

بھیک مانگتا رہتا ہے۔

ہم زندگی بھر سوکھے ہوئے تالاب پر بیٹھے ہوئے ہنس کی طرح تعلق نبھاتے نبھاتے مر جاتے ہیں، کہانی ختم ہو نہ ہو کردار ختم ہو جاتے ہیں اور تعلق ٹرانسفر بھی تو ہو جاتے ہیں۔اِس کا عشق اُس کے گھر، اُس کے خواب اِسکی جنت اور ایک کی لگن دوسرے کی کامیابی۔

انسان جب تعلق بنانا چاہے تو کچھ نہ کچھ کر کے بنا ہی لیتا ہے اور پھر عمر اس تعلق کو پختہ کرنے میں گزار دیتا ہے۔ان تمام تعلقات میں جو سب سے اہم تعلق تھا وہ بھول جاتا ہے، اسے کمزور کر چھوڑتا ہے، وہ یک طرفہ رہ جاتا ہے، ادھورہ چھوٹ جاتا ہے،، ایسا تعلق جو اس کے وجود میں آنے سے پہلے شروع ہوا تھا، جسکی گواہی الست بربکم ، قالو بلیٰ سے دی تھی۔خدا بندے کو نہیں بھولتا، بندہ ہی خدا کو بھول جاتا ہے۔کوئی وقت کوئی گھڑی مخلوق سے بچا کر اپنے خالق سے بھی بات کرنی چاہئے، اس تعلق پر بھی غور کرنا چاہیے، کبھی رات بستر پر چادر اُوڑھ کر موبائل کے نائٹ پیکجز کی طرح اپنے رب سے بھی گفتگو کرنی چاہیے، جو ہمیشہ سنتا ہے اور انتظار میں رہتا ہے۔

دنیا کے تعلقات بندے کو کمزور کر دیتے ہیں، چلنے پھرنے کی سکت تک چھین لیتے ہیں۔ایسے میں مالک سے کنیکٹ ہونا ہی پڑتا ہے۔یہ ایک تعلق سب سے سچا ہے۔اللہ دھتکارتا نہیں ہے، دھتکارے ہوؤں کو سہارا دیتا ہے، دلاسہ دیتا ہے، وعدے کرتا ہے، بشارت دیتا ہے، اپنی پہچان دیتا ہے، اپنی نسبت دیتا ہے۔

نیکی اللہ سے ایک تعلق ہی تو ہے، اور گناہ بھی۔اُسی کی تو نافرمانی کرتا ہے بندہ اور کسی کی تو نہیں۔جو چاہے سزا دے، چاہے تو معاف کر دے، چاہے تو مسکرا دے اور سارے دھوڈالے۔حق اس کا ہے جو حق ہے، آپ کیوں بولتے ہیں؟ بندے اور مالک کے بیچ گفتگو میں کمینٹری کرنے والے ''لاتعلق'' رہ جاتے ہیں، اس ستارے کی طرح جس کا کوئی مدار نہیں، اس لاؤڈ سپیکر کی طرح جسکی کوئی مسجد نہیں، اور اس دل کی طرح جسکا کوئی محبوب نہیں

یہ وہ تعلق ہے جس پر کام کرنا چاہئے۔بندہ رب سے دور جائے ہی کیوں؟ رب کے آس پاس رہنا چاہئے، جانے کب کونسا کام لے لے اور تعلق میں شکایت نہیں ہوتی۔غیروں سے گلا کرنا محبت کا شرک ہے۔چلیں کوئی دل گرفتہ اپنے رب سے مخلوق کا گلا کرے تو کچھ سمجھ میں بھی آتا ہے کہ غریب آدمی روئے بھی نہ تو کیا کرے، مگر مالک کا گلا مخلوق سے، بڑی کم ظرفی کی بات ہے۔

اور لوگوں کو اپنی خودساختہ بنائی گئی پالیسیوں میں تولنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ ہمارا اپنا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جو HR مینوئل قرآن کی صورت میں آیا ہے اس سے کب کب انحراف کیا؟

غیر مسلم ہی سہی، کافر ہی سہی، معذور ہی سہی، بدصورت ہی سہی، ہے تو اسی کا بندہ، کیا پتہ کب کسی کا کیا تعلق ہو؟

ظلم کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہئے کہ مظلوم کی جس دن رسائی آپ سے زیادہ طاقتور تک ہوگئی وہ آپ کا کیا کرے گا۔ اگر وہ جانماز پر بیٹھ گیا تو کہاں سے ملے گی پناہ؟

ایسے بندے کو کبھی کچھ نہیں کہنا چاہیے جس کا اللہ کے سوا کوئی نہ ہو۔

ہمارے معاشرے میں عجیب لوگ ہیں. اللہ کے نام پر اللہ کی مخلوق سے اللہ کے لئے نفرت کرتے ہیں۔ اگر اللہ نے کہہ دیا کہ وہ تو اس سے محبت کرتا ہے تو کیا ہوگا؟

تعلقات کی اِس پُر فریب دنیا سے متعلق رہ کر اس سے تعلق کا دعویٰ تو وہ کرے جسکی آنکھوں کے حلقے اسکی بن بادل برسات کی گواہی دیں۔ جسکی کمر بستر کی گرمی کو ترسے اور جسکا دل صرف ایک تعلق کی فکر میں گھُل جائے۔ باقی میرے جیسے بندوں کو تو ڈرنا ہی چاہئے۔ کسی دن کوئی تعلق والا زبان کے نیچے آ گیا تو آہوں کے حصار میں دعائیں راکھ کر دے گا۔

☆.....☆.....☆

خوابوں کے سوداگر

پاکستانیوں کی تین قسمیں ہیں۔ شکوہ، جواب شکوہ اور خوابوں کے سوداگر۔ شکوہ پارٹی میں وہ لوگ آتے ہیں جن کی زبان پر ہر وقت ملک کے لئے کوئی طعنہ، برائی، گالی، بری بات، کسی بدقسمتی کا رونا، اور شکوہ در شکوہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ خوابوں کے گورکن ہوتے ہیں اور اُمیدوں کے قبرستان میں قبریں بنانے کا کام کرتے ہیں۔

یہ مسئلے کا حصّہ ہوتے ہیں اور تا حیات اس میں اپنا حصّہ ڈالتے رہتے ہیں۔ آپ ان کے پاس کوئی خواب لے جائیں، کوئی اچھی بات، کوئی کامیابی یا غلطی سے کبھی کسی کامیاب آدمی کا ذکر کر بیٹھیں، یہ آپکو اس میں وہ وہ نقائص نکال کر دیں گے، وہ وہ معائب بیان کریں گے کہ آپکو اس کام یا شخص سے ہی نفرت ہو جائے گی۔ یہ لوگ پنج وقتہ حاسد ہوتے ہیں اور تا عمر اپنی حسد کی آگ میں جلتے رہتے ہیں. اللہ برکت دے۔ انہیں اپنے مرنے سے زیادہ لوگوں کے جینے کا غم ہوتا ہے اور یہ سجدوں میں بھی دوسروں کو بد دعائیں دیتے رہتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ لوگ معاشرے میں دانشور اور لکھاری شمار ہوتے ہیں۔

دوسرے گروہ میں جو لوگ آتے ہیں وہ جواب شکوہ ہوتے ہیں۔ یہ پہلے گروہ کی ہر اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں، یہ ملک کے گیت گاتے ہیں، اور روز کسی چوراہے پر کھڑے ہو کر پازیٹو تھنکنگ کا منجن بیچتے ہیں۔ ان لوگوں کی رگوں میں خون کی بجائے جذبات پارہ بن کر دوڑتے ہیں، اور یہ ہر خامی، ہر غلطی، ہر کوتاہی کا جواب کسی غیر ملکی سازش یا کفّار کی کسی دقیق پلاننگ سے جوڑ دیتے ہیں۔ ان کے جذبات کے آگے کوئی اہل دین آ جائے تو اسے کافر و ملحد ثابت کر کے چھوڑتے ہیں، اسلام آ جائے تو روشن خیالی کا ڈھول پیٹنے لگتے ہیں، کوئی کاروباری شخصیت آ جائے تو اسکی زندگی بھر کی محنت کو حرام کا پیسہ بنا کر چھوڑتے ہیں، اور اگر کبھی غلطی سے کسی نے سامنے اپنا نظریہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بیان کرنے کی جسارت کر لی تو اسکی وہ کردار کشی کرتے ہیں کہ اسے عمر بھر کو چپ لگ جائے۔

انہیں نہ ملک میں کوئی ظلم نظر آتا ہے، نہ نا انصافی، نہ ہی کوئی زیادتی نہ جبر۔ بیوقوفوں کی جنت میں رہنے والا یہ ٹولہ بھی مسئلے کا حصّہ ہوتا ہے۔ امّت کے غم میں نڈھال، ملکی محبت سے سرشار، حبّ الوطنی کے علمبردار، خدائی فوجدار جب چاہیں، جسے چاہیں، غیر ملکی ایجنٹ قرار دیدیں، کفر کی سند ہاتھ میں تھما دیں، بدکرداری کی تہمت جاری کر دیں یا حرام کی کمائی کا راگ الاپنا شروع کر دیں۔ حبّ الوطنی کے چابک سے جتنی کھالیں انہوں نے اتاری ہیں اور جتنے خواب ان کے ہاتھوں دفن ہوئے ہیں اتنے تو پہلے گروپ نے دیکھے بھی نہیں ہونگے۔ اس پارٹی کے لوگوں کو بڑے بڑے حکومتی عہدے، بیوروکریسی اور ان اداروں میں جگہ ملتی ہے جو سفید و سیاہ کے مالک ہوتے ہیں اور بلیک اینڈ وائٹ زندگی گزار دیتے ہیں۔

تیسرا اور آخری گروپ، آہ! کیا بات ہے ایسے لوگوں کی، خوابوں کا سوداگر ہوتا ہے۔ انہیں خواب دیکھنے کی پیدائشی بیماری ہوتی ہے، یہ سوتے ہیں تو خواب دیکھتے ہیں، جاگتے ہیں تو خواب دیکھتے ہیں، روتے ہیں تو خواب دیکھتے ہیں، ہنستے ہیں تو خواب دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ مسئلے کا حل نکالتے ہیں، یہ خوابوں کے معمار ہوتے ہیں۔ اپنے خواب بھی بناتے ہیں اور دوسروں کے بھی۔ انہیں صرف مسئلے کے حل کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ کس نے کیا، کب کیا، کیا کیا، کیوں کیا، یہ تمام سوال لایعنی ہو جاتے ہیں۔ مزاج کے اتنے ٹھنڈے ہوتے ہیں کہ لوگ بے غیرت کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ لوگ مر رہے ہیں، جنازے اُٹھ رہے ہیں، گھر جل رہے ہیں مگر یہ چپ سادھے، سر جھکائے اپنے خوابوں کی آبیاری میں لگے رہتے ہیں۔ یہ سب فطری طور پر فقیر ہوتے ہیں، وہ نہیں جو بھیک مانگے بلکہ وہ جو مٹی میں ملے ہوئے ہوں، ویسے بھی بھکاری اور فقیر میں ایک ہی تو فرق ہے۔ بھکاری سب سے مانگتا ہے، فقیر ایک سے مانگتا ہے۔ انہیں پتا ہوتا ہے کہ جو سنتا ہے، وہ چُنتا ہے۔ ان لوگوں کی ساری عمر خواب بُنتے اور خواب بنتے گزر جاتی ہے۔ یہ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے، بس کہیں نہ کہیں، چپ چاپ، معاشرے میں اپنا حصّہ ڈال رہے ہوتے ہیں بغیر کسی توجہ، کسی شہرت، بدلے، انعام اور غرض کے۔ نہ زندہ ہوتے ہیں تو کوئی جانتا ہے، نہ مرنے پر چار بندے جنازے پر جمع ہو پاتے ہیں۔ خوابوں کے یہ سوداگر، عادی ظالموں کے اس ملک میں روز زکوٰۃ دیتے ہیں۔ لوگوں کا ظلم، حسد، جبر اور جھوٹ سہہ کر۔ ان لوگوں کو شکوہ پارٹی والے بے وقوف کہتے ہیں اور کسی لائق نہیں سمجھتے اور جواب شکوہ والے جاہل کہتے ہیں کہ انہیں دنیا میں کیا ہو رہا ہے اسکا کچھ پتا ہی

نہیں ہے۔ یہ لوگ ڈسے جاتے ہیں، دھمکائے جاتے ہیں، مار دیے جاتے ہیں، ملک بدر ہوتے ہیں۔ یہ جنہیں بناتے ہیں وہی انہیں مٹی میں دفن کر دیتے ہیں یہ سوچے بنا کے یہ بیج ہوتے ہے، پھر نکلتے ہیں، سر چڑھتے ہیں اور پھر کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ ان کی تھالی میں لوگ چھید کر دیتے ہیں، یہ سوچے بنا کہ کنویں میں تھوکنے والوں کی پیاس چھن جایا کرتی ہے اور بھلا پیاس سے معتبر بھی کوئی چیز ہوتی ہے کیا؟

یہ لوگ اکیلے رہ جاتے ہیں، گونگے ہو جاتے ہیں کہ بات سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اپنے خوابوں کو بچانے کے لئے آنکھیں تک بیچ دیتے ہیں، منزل کو پانے کے لئے راستے بناتے چلے جاتے ہیں کہ کوئی تو اُٹھے گا، کوئی تو آئے گا، کوئی تو چلے گا۔ انہیں زندگی بھر منزل نہیں ملتی، منزل تو بیوقوفوں کو ملتی ہے، عقلمند آدمی ہمیشہ سفر میں رہتا ہے۔ ان لوگوں کے دل میں سکون اور دماغ میں ہمیشہ خلجان رہتا ہے۔ خواب بیچتے بیچتے یہ ایک دن اپنے خوابوں کے ساتھ دفن ہو جاتے ہیں، مگر زندگی بھر کی کارگزاری میں سینکڑوں آنکھیں چھوڑ جاتے ہیں جو خواب دیکھنا جانتی ہیں۔

جس خاک سے پھوٹا ہے، اس خاک کی خوشبو
پہچان نہ پایا تو ہنر کس کے لئے تھا
اے مادر گیتی تیری حیرت بھی بجا ہے
تیرے ہی نہ کام آیا تو سر کس کے لئے تھا

(پروین شاکر)

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لکھاری

لکھنے والے اور پڑھنے والے یوں تو ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ٹھہرے، مگر ان دونوں کی کیفیات اور کرب میں صدیوں کا فاصلہ ہے۔لکھاری بہت مظلوم ہوتا ہے، وہ تمام چیزیں ،واقعات، کیفیات، جزئیات، کارگزاری، دن اور راتیں جو سب کے لئے معمولی ہوتی ہیں وہ لکھنے والے کو مستقل عذاب میں رکھتی ہیں، وہ جب تک ان کرداروں کو صفحات پر منتقل نہ کردے اسے چین ہی نہیں آتا۔

اور کتنا فرق ہوتا ہے نا لکھنے والوں اور وہ جو لکھے گئے، وہ جو لکھے جانے کے قابل تھے، وہ جو لکھے جانے کے شوقین تھے اور پیسہ دے کر اپنی برہنہ شخصیت کو روشنائی کی پوشاک پہنانا چاہتے تھے۔ یہ جانے بنا کہ روشنائی تو ہر چیز کو مزید روشن کر دیتی ہے۔اس کالے بورڈ کی سیاہی کی طرح جو سفید چاک سے اور نمایاں ہو جاتی ہے۔اور وہ جو لکھنے کی پاداش میں جلاوطن ہوئے، قتل کروا دیئے گئے، مٹا دیئے گئے، اور وہ جنہیں لکھے ہوئے کو مٹانے کا زعم تھا، اور وہ جو لکھے ہوئے کو ماننے کو تیار نہ تھے، اور کچھ ایسے بھی خوش نصیب کہ ہمّت کے کانے اور شکر کی دوات سے قسمت کے کنوس پر جو چاہے لکھ دیں اور کائنات ان کے لکھے کی اپنے لکھے سے ہم آہنگی پر مسکراتی رہے۔

لکھاری کا لوح وقلم سے بڑا تعلق ہوتا ہے، وہ لکھے میں سے لکھتا ہے اور بیوقوف لوگ اسے ادیب جان کر قابل ستائش سمجھتے ہیں اور وہ جو سب سے بڑا لکھاری ہے اسے بھول جاتے ہیں۔

آخر لکھے میں سے لکھنا کون سی بڑی بات ہے؟

لکھاری معاشرے کی غلاظتوں کو بیان کر کے سارا گناہ اپنے سر لے لیتا ہے۔ وہ تو جسم لکھتا ہے۔آنکھیں تو قارئین کی ہوتی ہیں، جو چاہیں رنگ دے دیں، چاہیں تو جسم کو حسن کی حدّت میں جلا کر راکھ کر دیں اور چاہیں تو جسم کو دیوتا بنا کر عقیدت میں غرق ہو جائیں۔

لکھنے کا فن سیکھا بھی جاتا ہے اور ودیعت بھی ہوتا ہے، جو لکھ کے پڑھتے ہیں وہ اچھا لکھتے ہیں ، جو پڑھ کے لکھتے ہیں وہ کمال کرتے ہیں، آنکھ کھلی ہو تو قدرت کی ہر شے میں لکھا نظر آتا ہے، وہ بھی جو صاف ظاہر ہے اور وہ بھی جو پوشیدہ۔ بادشاہوں کی تقدیر ماتھے پر سجائے لوگ قسمت کا رونا روتے ہوئے کتنے عجیب لگتے ہیں نا؟

کچھ لوگ کہانیاں لکھتے ہیں اور کچھ کو کہانیاں لکھتی ہیں۔محبت کی تشریح ممکن ہی نہیں، یہ تو محبت ہے جو بندے کو ڈیفائن کرتی ہے۔نجانے لوگ کیسے دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں کسی سے اللہ کے لئے محبت ہے، مجھے تو آج تک اللہ سے اللہ کے لیے محبت نہ ہو سکی۔

دعاؤں کی طرح لکھے گئے کی بھی کوئی ایکسپائری معیاد نہیں ہوتی، جس طرح آپکی دعا کہ اللہ اسے چلنا سکھا، بولنا سکھا تا عمر قابل استعمال رہتی ہے اسی طرح لکھا ہوا بھی صدیوں تک اپنے وجود کی گواہی دیتا رہتا ہے۔

اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ لکھنے والے لکھے ہوئے سے ڈر جاتے ہیں، علم سے ڈر جاتے ہیں، ہوش کھو بیٹھتے ہیں اور پھر یہاں سے آگہی کا سفر شروع ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پیری فقیری ڈاٹ کام

نفسانی خواہشات کا لامتناہی سلسلہ اور انکی پلک جھپکنے میں تکمیل انسان کی دو ایسی کمزوریاں ہیں جو ہر دور میں بکتی ہیں، جس پر لوگ پیسہ کماتے ہیں، انسان دھوکہ کھاتا ہے، ذلیل وخوار ہوتا ہے، مگر باز نہیں آتا۔ گئے وہ زمانے جب صاحب علم کسی شخص کو اسکے مرتبے یا حیثیت کی وجہ سے حلقہ بگوش کرنے کو طریقت کا شرک سمجھتے تھے۔ آج کل تو ایک دوڑ ہے کہ فلاں شخص فلاں کا مرید ہے، اور فلاں شخص فلاں سے بیعت ہے۔ نام نہاد عقل کے اندھے مرید اپنے اپنے شیوخ کے وہ وہ کارنامے اور کرامات گنواتے ہیں کہ بیچارہ شیخ خود سن لے تو مارے حیرت کے بیہوش ہو جائے۔

یوٹیوب اور فیس بک پر ریڈی میڈ مفتیوں کی ایک فوج موجود ہے. پانچ ہزار سے اوپر مفسرِ قرآن تو صرف یوٹیوب پر موجود ہیں۔ جتنے مفسر اُمّت مسلمہ نے 1400 سال میں پیدا نہیں کیے اتنے یوٹیوب نے پانچ سال میں پیدا کر دیئے۔ غضب خدا کا جنہیں عربی کا ایک لفظ تک نہیں آتا وہ بھی تفسیر پڑھانے نکل پڑے. آدھا اسلام ''بابا'' کی پُر مغز گفتگو سے سیکھ لیا، جس کا جو چاہا جیسا چاہا وہ مطلب نکال لیا تو آدھا یوٹیوب سے۔ لو جی ہو گئے پورے مفتی۔ کسی کو پیشن گوئیوں کی بیماری لگ گئی تو کسی صحافی کو خوابوں کی عادت پڑ گئی۔ یہاں آنکھ لگی اور یہاں خواب وارد اور وہ وہ پیشن گوئیاں کہ دجال سے لے کر نیو ورلڈ آرڈر تک سب کا پتا چل جائے۔ پتہ نہیں تکیے پر سر پہلے رکھتے ہیں یا خواب پہلے آتا ہے۔ جس قوم نے تاریخ نسیم حجازی سے پڑھی ہو اور فرائض ٹی وی ڈراموں سے سیکھے ہوں، گناہ پیروں سے بخشوائیں ہوں اور راہ سلوک کے ساتھ سوتیلی ماؤں والا سلوک کیا ہو۔ اس سے توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر اندھے مریدوں کی تقدیر میں اندھے پیر لکھ ہی دیے گئے ہیں جو ان کی دنیا و آخرت برباد کر کے ہی چھوڑیں گے تو میں کیوں نہ اس ادھم مستی میں اپنی دنیا ہی بنالوں؟ بس میں جلد ہی پیری فقیری ڈاٹ کام کے نام سے ایک سٹارٹ اپ شروع کرنا چاہتا ہوں، ویسے بھی آج کل انٹر پرنیرشپ کا زمانہ ہے اور اس

آئیڈیے کی مارکیٹ بھی بہت زیادہ ہے، بیچنے کے لئے لوگوں کو خاطر خواہ کنونس بھی نہیں کرنا پڑے گا۔

کسٹمر چند سو روپے دے کر اپنی اکاؤنٹ پروفائل بنایگا، عورتوں کے لئے خصوصی رعایت ہوگی۔ اپنی پریشانیاں بتائیں اور ہم مشین لرننگ اور ڈیٹا مائننگ کے ایڈوانس الگورتھم استعمال کرتے ہوئے آپکو کسی نہ کسی پیر سے کنیکٹ کر ہی دینگے۔ اولاد کی خواہش، مال و دولت، پسند کی شادی، شہرت و عزت والوں کو ''جمالی پیروں'' کے پاس فارورڈ کر دیا جائے گا۔ ساس/سسر کی موت، انتقام، اور یہودی سازشوں کا قلع قمع کرنے والوں کو ''جلالی پیروں'' کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ اور ''امراض مخصوصہ'' کے ماروں کو ''خیالی پیروں'' کی طرف۔

کوئی ایک دو ملین سبسکرائبر ہو گئے تو ہم مرچنڈائس بھی بیچنا شروع کر دینگے۔ جھولے والے بابا کا جھولا، آسمان والے بابا کا نمک، زمین والے بابا کا توشہ، دروازے والے بابا کے جوتے، وہ والے بابا کا تعویذ، یہ والے بابا کا سرمہ، اور ''کوئی نہیں'' والے بابا کی دیگ۔ 500 روپے سے 5 لاکھ روپے تک کے مرادوں کو برلانے والے پیکجز، اور پھر ان بابوں کو بھی مرید بیچ دیا کرینگے۔ پانچ سو کا جشہ، پانچ ہزار فیس بک لائکس، اور پچاس ہزار فولورس۔

کیا بات ہے، اور خالصتا شرعی کام، حلال منافع، ہے مجال کسی کی جو کچھ کہہ سکے۔ بابوں اور مریدوں کو کہہ کر چنوا دیں گے دیواروں میں۔

پھر ہم سوشل میڈیا پر پیری فقیری ڈاٹ کام کا سالانہ عرس بھی کیا کرینگے، کوک سٹوڈیو کے بھنگڑے بھی ڈالیں گے، ہر شرابی کبابی کی قوالی بھی چلائیں گے، ہر غائب دماغ فلسفی کی تصویریں بھی سجائیں گے۔ اور ایک بار یہ آئیڈیا چل پڑے تو کفن دفن ڈاٹ کام، لڑائی جھگڑا ڈاٹ کام، تعویذ گنڈا ڈاٹ کام، اسکی بیوی میری محبوبہ ڈاٹ کام، یہودی سازش ڈاٹ کام بھی شروع کر دینگے۔

اُمید ہے آپ اس کار خیر میں تن، من، دھن سے شرکت کر کے جنت میں ایک بیش قیمت پلاٹ اپنے نام ضرور کروائیں گے۔

اس مضمون کو 50 لوگوں کے ساتھ شیئر کریں اور شام سے پہلے اصلی تے وڈے والے بابا کے مرید بن جائیں۔ یہ پیشکش صرف محدود مدّت کے لئے ہے۔ خواتین کو خصوصی رعایت دی جائے گی۔

☆.....☆.....☆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بڑا آدمی

ابّا مجھے بڑا آدمی بننا ہے، بہت بڑا۔ بہت پیسہ کمانا ہے، بہت شہرت و نام کمانا ہے اور بڑی کامیابی چاہئے۔

MBBS کے آخری سال کے طالب علم اسلم نے اپنے ان پڑھ باپ سے کہا

نہ بیٹا نہ، ایسا نہیں کہتے۔ بھلا پیسوں، شہرت اور ڈگری کا بڑے آدمی بننے سے کیا تعلق؟

بوڑھے باپ نے سوال کیا؟

دیکھ بیٹا اسلم، یہ زندگی کا سفر ہے نا یہ بشر سے انسان کی طرف چلتا ہے، پھر انسان سے بندہ بنتا ہے اور پھر بندے سے کامیاب آدمی اور ایسا آدمی بڑا ہوتا ہے۔

ابّا کچھ سمجھ نہیں آیا، اسلم نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے پوچھا۔

بیٹا، بشر وہ ہے جس میں علم حاصل کرنے کی جستجو ہے (جانوروں میں نہیں ہوتی)، جو علم سیکھ لے وہ انسان ہو جاتا ہے (اور علم وہ جو اخلاقی اقدار سکھائے)، پھر جو اس علم کو سیکھ کر اس پر عمل کر لے وہ بندہ بن جاتا ہے اور رب کی بندگی میں لگ جاتا ہے، بے شک بندگی سے بڑی سند اور کوئی نہیں، اور جس کی یہ بندگی قبول ہو جائے وہ ہوتا ہے کامیاب اور بڑا آدمی۔ حشر میں اللہ آپکو دیکھ کر مسکرائے اور آپ اللہ کو دیکھ کر یہ ہوتی ہے اصل کامیابی اور ایسی کہ جس پر فخر کیا جا سکے۔ آدمی جب بڑا ہوتا ہے تو دنیا چھوٹی ہو جاتی ہے۔

اسلم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے باپ کی بات کو بیچ میں سے کاٹا۔

ابّا تو چھوڑ ان فالتو باتوں کو، میں ڈاکٹر بن کے ڈھیر سارا پیسہ کماؤنگا، اس پیشے میں بہت منافع ہے، پھر تجھے یہ دوپٹے رنگنے کا کام نہیں کرنا پڑے گا۔

نہ بیٹا نہ، ڈاکٹری پیشہ نہیں خدمت ہے اور خدمت میں نظر معاوضہ پر نہیں ہوتی۔ بندہ تو بس

اپنی سی کوشش کر کے اپنے آپ کو باری تعالیٰ کے حضور پیش ہی کر سکتا ہے۔ چناؤ تو وہاں سے ہوتا ہے۔ اللہ بڑا قدر دان ہے۔ اس کی دی ہوئی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرو تو وہ اور نوازے گا۔ بیٹا تو بس دعا مانگنا سیکھ لے، دعا پکار کو کہتے ہیں، ایک دُہائی ہے، نام چنّا ہے اور دعا کے اول و آخر میں شکر ملا لے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ شکر گزار کو سزا نہیں دیتے بلکہ نواز دیتے ہیں۔

اسلم نے پھر بات اچک لی، ابّا اس دنیا کو تو میں اپنے پاؤں تلے روند کے دکھاؤنگا، میرے میں صلاحیتیں ہیں، عقل ہے، جنون ہے، کچھ کر دکھانے کی لگن ہے، سب سے آگے نکل جانے کا جذبہ ہے، ایک ویژن ہے، نظم وضبط ہے، حاضر جوابی ہے۔

نہ بیٹا نہ، حاضر جواب لوگ تو بے وقوف ہوتے ہیں، جسے اللہ کا ڈر ہو وہ بھلا حاضر جواب کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو کئی بار سوچے گا بولنے سے پہلے۔ اور یہ جو دنیا ہے یہ کسی کی نہ ہوئی اور کسی سے نہ روندی گئی، یہ تو ایک آزمائش ہے۔ کسی بزرگ نے دنیا کو خواب میں دیکھا تو وہ کنواری لڑکی کی شکل میں نظر آئی۔ انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ تو ابھی تک کوری پتے میں ہی ہے؟ دنیا نے ہنس کے جواب دیا کے جو مرد تھے انہوں نے ہاتھ تک نہ لگایا، اور جو مرد نہ تھے وہ کوششوں میں لگے رہے۔

اسلم پر ان باتوں کا کیا اثر ہوتا، زندگی کے اگلے 30 سال وہ اپنے کہے کو سچ ثابت کرنے میں جتا رہا اور بوڑھا باپ دوپٹے رنگتا رہا۔

آج بوڑھے باپ کا آخری وقت ہے، اسلم سرہانے بیٹھا ہے۔ کہنے لگا، ابّا سب کچھ ہے میرے پاس مگر دل کا چین اور روح کا سکون نہیں ہے، پتا نہیں کہاں چوک ہو گئی ہے؟

کچھ نہیں بیٹا، بس تیرے رنگ بکھر گئے ہیں۔ کبھی کپڑا بننے سے پہلے بھی کوئی رنگ چڑھتا ہے؟

رنگ تو بندے پر چڑھتا ہے۔ بندگی کی بناوٹ پوری ہو جائے تو پھر جو چاہو رنگ چڑھا دو ورنہ سب اکارت ہو جاتا ہے۔

بیٹا ایک آخری بات سن لے

بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جسے پتا ہو کہ وہ سب سے چھوٹا ہے۔

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عاجزی

عاجزی پتہ نہیں کسے کہتے ہیں؟ وہ کون لوگ ہوتے ہیں جنہیں ملتی ہے، جن کے ساتھ رہتی ہے ، جن سے نباہ کرتی ہے۔ پتہ نہیں اب ایسے لوگ پائے بھی جاتے ہیں یا مفقود ہو گئے؟ ہماری سمجھ میں تو یہ آج تک نہ آئی، نہ ہی کوئی ایسی خوش فہمی یا اُمید ہے کہ زندگی میں کبھی آ سکے گی۔ لوگوں کو طلب ہوتی ہے۔ کیوں جھوٹ بولیں۔ یہاں تو وہ بھی نہیں۔

جی حضرت کہنے سے اگر عاجزی آ سکتی تو آدھا پاکستان ولی اللہ ہوتا۔ پتہ تو اس دن چلتا ہے جب یہ ''حضرت جی'' آپکی مرضی و منشا کے خلاف کچھ بول دیں، اگلے دن حضرت جی کی چھٹی۔ ان کے عقائد سے لے کر ظاہر و پوشیدہ حالات پہ وہ تنقید کہ اللہ کی پناہ۔ ہم پاکستانی بھی عجیب قوم ہیں، جس فلٹر سے لوگوں کی شخصیت کو چھانتے ہیں اس میں سے تو شاید نبوت ہی باہر نکلے، کسی سے عقیدت کریں تو ابدال ثابت کر کے چھوڑیں اور تنقید پر آئیں تو ملحد و کافر کے درجات تو معمولی باتیں ہیں۔

نام نہاد عاجزوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو زمین پر جھک جھک کے چلتا ہے۔ آواز اتنی ضعیف نکالتا ہے کہ ایڈز کے مریض کا گمان ہو اور ہر بات پہ کہتا ہے کہ بھائی میں تو عاجز بندہ ہوں۔ پتا نہیں یہ عاجزی کا مریض و بیمار لوگوں سے کیا تعلق ہے اور زبانی تکرار سے اپنے عاجز ہونے کا یقین کسے دلاتے ہیں؟

اور کچھ ایسے بھی کہ جوتوں کو سیدھا کر دیں تو عاجزی کے علمبردار ٹھہریں۔ کیا پتہ کون عاجزی میں کرے، تو کوئی میرے جیسا کہ میں اتنا بڑا آدمی اور مسجد میں لوگوں کے جوتے سیدھے کر رہا ہوں۔ کیا بات ہے، واہ بھئی واہ۔ لوگوں کا تریاق، میرے لیے زہر۔

جس کا نفس عاجزی سے موٹا ہو جائے، جس کا کبر عاجزی پہ پلے، وہ کہاں جا کے دہائی دے؟

مئے کا نشہ ایک رات میں اتر جاتا ہے، ''میں'' کا نشہ زندگی بھر نہیں اُترتا۔ تربیت تو وہاں ہو جہاں نفس پر چوٹ لگے۔ بابا صاحبا، میاں جی، پیر صاحب کے نعروں میں تو بندہ عاجزی سے عاجز ہو جائے۔

میرے دوست طارق بلوچ صحرائی صاحب کہتے ہیں کہ ''خدا جب کسی کو عاجز کرنا چاہے تو اس سے عاجزی چھین لیتے ہیں۔'' عمر بھر میں یہ جملہ سمجھ آ جائے تو بہت ہے۔

پتہ نہیں کہاں سے ملے گی یہ عاجزی؟ پھٹے پُرانے کپڑے، بوسیدہ کھانا اور بڑھے ہوئے بال۔ داڑھی نہیں جھاڑی ہو گئی۔ اگر یہ عاجزی ہے تو بھکاری کسے کہتے ہیں؟

کیا ایسا کبھی ہوا ہے کہ بندہ عاجزی رکھتا ہو اور فقیر نہ ہو؟ دے سکتا ہو مانگے نہ؟ حق رکھتا ہو اور چھوڑ دے؟ اختیار رکھتا ہو اور سہہ جائے؟ سچ بولے اور کاذب ٹھہرے؟ عاجز ہو اور مغرور کہلائے؟ ہونا تو ایسا ہی چاہئے۔

بات عاجزی کی ہو رہی ہے تو چلیں آئیں سرنڈر کر دیتے ہیں۔

اے اللہ سائیں میں عاجز آ گیا ہوں تیرے عاجز لوگوں سے۔ ربِ کریم اُمت میں ہر شخص ریڈی میڈ شہادت چاہتا ہے، ایمان پہ مرنا چاہتا ہے۔ میں ایمان پہ جینا چاہتا ہوں۔ کوئی لوگ دکھا جو جینے کی بات کریں۔ اُمید دلائیں۔ زندگی کی بات کریں۔ آسمانوں کو مسخر کریں، زمین کی قناطیں کھینچیں۔ مجھے سمجھ کچھ نہیں آتا۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میرا ہاتھ پکڑ، مجھے پار لگا۔ غلط سمت دوڑنے سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی صحیح سمت منہ کر کے کھڑا ہو جائے سو میں تیری طرف دیکھ رہا ہوں۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں عاجز ہوں اپنے آپ کو گناہوں سے روکنے سے، عاجز ہوں کہ جھوٹ سے باز آؤں، عاجز ہوں کہ ظلم نہ کروں۔ اپنے آپ پر روز ظلم کرتا ہوں۔ اپنے آپ سے روز جھوٹ بولتا ہوں۔ یا ذوالجلالِ واکرام میں عاجز ہوں اِس بات سے کہ غرور نہ کروں۔ میں روز آئینہ دیکھتا ہوں اور اپنی پوشاک اور جسم پر ناز کرتا ہوں۔ میں عاجز ہوں اس بات سے کہ تیری مان کر چلوں۔ اور میں عاجز رہا اس بات سے کہ عاجز بن کے رہوں، عاجزی اختیار کروں۔

اے اختیار والے اللہ، ایسا اختیار جس پر عجز کوئی نہیں۔ معاف کر دے مجھے کہ میری عاجزی لُٹ گئی۔ میرے اپنے نفس کے ہاتھوں۔

اے دیکھنے اور سننے والے سمیع و بصیر اللہ۔ رحم فرما ان پر جن کی اُمید مر گئی، آرزو تمام ہوئی، اور ہمت جواب دے گئی۔ اے اختیار والے اللہ، تو چاہے تو مسل دے، چاہے تو بچا لے۔ تیری راہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں منتظر، عجز کی روح کو سمجھنے سے قاصر، نالائق و نافرمان، خاک کے پتلے، عاجزی کا ڈھونگ رچائیں تو بھی کس بات کا۔''

بس تو بے سبب بخش دے۔

☆.....☆.....☆

گُڑیا

چھپّی اُس کی زندگی کی پہلی دوست تھی۔ پتہ نہیں دوست تھی یا اُس سے کچھ زیادہ یا کم۔ تین سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے ایسی باتوں کو سمجھنے کے لیے۔ چھوٹے سے شوکت کے لیے سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی یہ گڑیا ہی کُل کائنات تھی۔ خوشی ہو یا غم، کھیل ہو یا کام، اُداسی ہو یا شرارت، انگنائی سے کوٹھا اور رسوئی سے زنان خانہ۔ پورے گھر میں شوکت اپنی چھپّی کے ساتھ مٹرگشت کرتا رہتا۔ بچپن کی دوستی، جوانی کی محبت اور بڑھاپے کا غم بھلائے نہیں بھولتا۔ وقت گزرتا گیا اور چھپّی زندگی کے عناصر میں سے ایک بن گئی۔ کچھ سال بیتے کہ شوکت کو چھپّی سے اُلجھن ہونے لگی۔ وہ اس کے ساتھ بات کرتا تو اِسکول کا ہوم ورک رہ جاتا۔ رات جاگتا تو صبح لیٹ ہو جاتا، ایک دن اُستاد نے کام مکمل نہ کرنے پر مار لگائی تو شوکت نے گھر آ کر سارا غصہ چھپّی پر نکال دیا۔ وہ بے زبان کیا بولتی، بال نوچ ڈالے۔ ہاتھ پاؤں توڑ دیئے۔ کپڑے پھاڑ دیئے اور اُٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیا۔ گھر میں کسی نے سکھ کا سانس لیا تو کسی نے ہنسی میں اُڑا دیا مگر پتہ نہیں کیوں شوکت کی ماں کی آنکھ نم ہوگئی۔

اِس کے بعد تو شوکت کا یہ معمول ہی ہو گیا، نئی گڑیا لاتا، بناتا، سنوارتا، کھیلتا، پیار کرتا اور جس دن غصہ آتا توڑتا تاڑ کے پھینک دیتا۔ اِس مشغلے میں اب تو اس نے گڑیوں کو نام دینا تک چھوڑ دیئے تھے۔

غریب کا حال اور امیر کے احوال کب کسی کو نظر آتے ہیں، کسی نے دھیان ہی نہ دیا اور شوکت بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی میں داخل ہو گیا۔

اس کے والدین ایک دن سچی مچی گڑیا اس کے لیے لے آئے۔ سنبل سے شادی نے شوکت کو جیسے اس کا دیوانہ بنا دیا۔ تھی بھی وہ گڑیا جیسی۔ گورا رنگ، سرمئی آنکھیں، سرخ ہونٹ، بھرے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بھرے رخسار، ہنسی ایسی کہ آبشار بہنے کا گھمان ہو اور سگھڑ ایسی کہ خاندان گُن گائے۔ دس انگلیاں دس چراغ تھی وہ۔ شوکت اس کی آنکھوں کا محور اور مجازی خُدا، جسے خوش رکھنا شاید اس کی زندگی کا واحد مقصد اور شوکت اس کی آنکھوں کا حُسن اپنے چہرے پہ سجائے یونہی اِتراتا پھرتا۔

وقت کا دھارا چلتا رہا اور کچھ ہی عرصے میں شوکت بے زار رہنے لگا۔ بات بات پہ جھگڑا اور تُو تُو میں میں۔ لشتم پشتم زندگی گزر رہی رہی تھی کہ ایک دن شوکت کو کاروبار میں نقصان ہو گیا جس کی وجہ ہمیشہ کی طرح سنبل ہی قرار پائی کہ وہ شوکت کو کہیں اور قرار لینے دیتی تو وہ دِل لگا کے کچھ کر سکتا نا۔

شوکت بپھرا ہوا گھر آیا، سنبل پر نظر پڑتے ہی اس کا دِل چاہا کہ بال نوچ ڈالے، ہاتھ پاؤں توڑ کے کہیں پھینک دے۔ اُس نے اپنے جارحانہ قدم ابھی بڑھائے ہی تھے کہ سنبل ڈر کے دیوار سے جا لگی، یہ کہنا مشکل ہے کہ زبان ڈر سے چپ تھی یا صدمے سے۔ اِس سے پہلے کہ شوکت کچھ کرتا، شوکت کی ماں دونوں کے بیچ میں آہنی دِیوار بن کر کھڑی ہو گئی کہ شوکت کو جاتے ہی بنی۔

سنبل اس دن کے بعد گھر میں نہ رُکی، حق تو یہ ہے کہ جِس نے مارنے کا قصد کر لیا اُس نے مار ہی دیا۔ جسمانی چوٹ کا کیا ہے لگی لگی نہ لگی، روح کے زخم کہاں رفو ہوتے ہیں۔

اِس بات کو چالیس سال گزر گئے، شوکت ہسپتال میں بستر مرگ پہ لیٹا ہے، پچھلی زندگی کسی فلم کی طرح اس کے سامنے چل رہی ہے، اس نے سوچا کہ اے کاش، جھپّی کو نہ توڑا ہوتا، زندگی نِکال کے زندہ رکھ چھوڑنے کا یہ کھیل نہ کھیلا ہوتا تو شاید آج زندگی مختلف ہوتی اور شاید کوئی گڑیا آج سرہانے ہوتی۔

شوکت کی آنکھ بند ہو گئی، کبھی نہ کھلنے کے لیے۔

☆.....☆.....☆

تاریخ پاکستان

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کے جیسے ہم آج بادشاہ عالمگیر، جنگ غدر، اسپین اور غرناطہ، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ پڑھتے ہیں، ایسے ہی آنے والی نسلیں جب آج کے پاکستان کو پڑھیں گی تو کیا پڑھیں گی؟ ہمارے ملک، ہمارے معاشرے کا اگر کوئی تجزیہ کرے یا تاریخ لکھے تو وہ کیا لکھے گا؟ شاید وہ لکھے کہ یہ ایک ایسا معاشرہ تھا۔ جِس میں تیری باقی تھی، جس میں ایمان کی رَمق موجود تھی، جِس میں دین کی چنگاری پنہاں تھی۔ ایک ایسی قوم تھی جو روز مرتی تھی مگر جینا نہیں چھوڑتی تھی۔ جو لُٹانے پر آئے تو سب کچھ لٹا دیتی تھی جو جیتے تو بچوں کی طرح گلیوں میں آ جاتی تھی۔ جو ناچتی تھی تو موسم بدل دیتی تھی اور جب روتی تھی تو آسمانوں کو رُلا دیتی تھی۔

بغیر اعلیٰ تعلیم کے، بغیر زندگی کی بنیادی سہولتوں کے بھی اگر یہ قوم یہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ نیو کلیئر پاور بن سکتی ہے، ہر چھٹے روز ایک خودکش حملے اور ہر چھٹے روز ڈرون حملے میں مرنے کے باوجود زندہ رہ سکتی ہے تو وہ کیا چیز ہے جو یہ نہیں کر سکتی۔

یہ ایک قوم تھی جس میں شدت تھی۔ محبت میں بھی اور نفرت میں بھی۔ جس کو کچھ دینے اور سب کچھ دینے کا فن آتا تھا۔ جس کے بچے کانے اور تختی سے پڑھ کے نکلے اور ایٹم بم بنا ڈالا۔ جو بغیر چھت کے سو جاتی تھی، جو بنا پیئے بھی سیراب تھی، اور جو ایک بار ٹھان لے اس کو پورا کرنے میں پوری کائنات اس کا ساتھ دیتی تھی۔

مگر اس قوم کو اپنی قوت کا اندازہ ہی نہ ہوا، اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ کس خمیر کی مٹی سے بنی ہے۔ اس کو لوگوں نے، لیڈروں نے اپنی اپنی منشاء کے مطابق بانٹا اور تقسیم کیا۔ اس نے اپنے محسنوں کو بھُلا دیا اور نجات دہندہ کو رد کر دیا۔ اس نے اپنے دین کو بھُلا دیا، اپنے ایمان کو بیچ دیا اور اپنے اوپر پڑھنا لکھنا اور سچ بولنا حرام کر لیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پاکستانی بھی عجیب قوم ہے یہ بیک وقت ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی۔ ہر شخص اپنے پہ ہونے والے مظالم کی داستان سُناتا ہے۔ مگر جب جہاں موقعہ ملتا ہے اپنے سے کمزور کو پیس دیتا ہے اور کوئی رعایت نہیں چھوڑتا۔ پردے کے ہلنے سے ڈرنے والا مسلمان اللہ سے نہیں ڈرتا۔ اس ملک میں لوڈ شیڈنگ بھی بہت ہے۔ صرف بجلی کی ہی نہیں کہ بلب بجھ گئے ہیں بلکہ خانقاہوں میں چراغ بھی بجھ گئے ہیں، مسجدوں کی رونق بھی بجھ گئی ہے۔ بچوں کے چہرے بھی بجھ گئے ہیں۔ اُمیدوں کی شمع بھی گل ہوگئی ہے، ستارون کی چمک بھی ماند پڑ گئی ہے، چاند کا حسن بھی زائل ہو گیا ہے اور منبر و محراب بھی خاموش ہیں۔ الغرض نصیبوں کی لوڈ شیڈنگ ہوگئی ہے۔

یہ قوم علم سے ایسے متنفر ہوئی، ایسی بے توفیق ہوئی کہ کوئی مہینے میں پانچ ہزار صفحات بھی نہیں پڑھتا۔ صرف وہ علم حاصل کرنا چاہتی ہے جس سے پیسہ کما سکے، معاشی حیوان بن جائے۔ مگر کاش ! پیسہ ہی کما لیا ہوتا۔ وہ بھی کہاں کمایا؟ مغرب کے پاس پیسہ ہے دین نہیں، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔

مورخ لکھے گا کہ جس قوم کو اپنے پیچھے ادارے، افراد، اور منصوبے چھوڑ کے جانے تھے وہ پلاٹس اور شاپنگ پلازے چھوڑ گئی۔ مورخ لکھے گا جس قوم نے روٹی اس لیے کھانی تھی کہ رزاق کا شکر ادا کر سکے مگر روٹی اُس قوم کو کھا گئی۔ مورخ لکھے گا ایک ایسی قوم تھی جو فطرت سے ٹکرا گئی اور پھر فطرت نے اُسے پچھاڑ دیا۔ مورخ لکھے گا کہ جتنا چھپا کے گناہ کرتی تھی اتنا چھپا کے نیکیاں کر گئی ہوتی تو سُرخرو ہو جاتی۔ اور شاید یہ بھی لکھے کہ جس اسلام کے نام پر ملک لیا، اسی اسلام کو اسی ملک میں سب سے زیادہ نظر انداز کیا۔

ایک ایسی قوم جسے غلامی سے عشق تھا۔ جس نے پلانگ کا سارا کام اپنے آقاؤں کے سپرد کر دیا تھا کہ غلام پلانگ تھوڑا ہی کرتا ہے۔ جس کا ریشہ ریشہ غلام تھا، جسے غلامی اچھی لگنے لگی تھی، جسے غلامی سے محبت ہوگئی تھی، جسکی رگ وپے میں غلامی سرایت کر گئی تھی۔ جس کا مزاج غلامانہ بن گیا تھا۔ جہاں غلامی کے بغیر جینا مشکل تھا، جہاں آزاد بندوں کا سانس رک جاتا تھا یا روک دیا جاتا تھا۔ ایک ایسی قوم جو نادیدنی زنجیروں میں جکڑ دِی گئی۔ جسے شک کی وادی میں ہانک دیا گیا۔ جس میں اعتماد نہ رہا اور جب اعتماد نہ رہے تو کیسے کوئی پہاڑوں کا سینہ چاک کرے اور کیسے کوئی کائنات کو مسخر کرے۔

اگر بندہ ہمت کرے اور محنت کرے تو نبوت کے علاوہ وہ کونسا ایسا مقام ہے جو حاصل نہ کیا

جا سکے۔ سُپر پاور بننے سے خُدا کی ولایت اور دوستی تک سب ہمت و اُمید کے ہی تو مرہونِ منّت ہیں۔ اور سب سے بڑا ظلم جو اِس قوم پر ہوا وہ اُمید کی غربت ہے۔ نا اُمیدی کا یقین ہے۔ اندھیرے کی نوید ہے جو ہمارے ٹی وی چینلز ہمارے جوانوں کی رگوں میں ہر روز نشے کی طرح اُتار رہے ہیں۔ پہلے کوئی سوچتا تھا کہ ایسے بولیں گے تو کوئی کیا کہے گا، جب سے میڈیا آزاد ہوا ہے وہ ''کوئی'' بھی مر گئی۔ ہمارے ملک میں لوگ زندگی کے خواب دیکھتے ہیں باہر والے خوابوں کی زندگی گزارتے ہیں۔ اور اب تو خواب دیکھنے والے بھی کم ہی رہ گئے ہیں۔ مہنگے خواب دیکھنے کے لئے آنکھیں بیچنا پڑتی ہیں، دن اور رات ایک کرنے پڑتے ہیں، پتّہ ماری کی محنت ہوتی ہے۔ مگر جو لوگ ہمت نہیں کرتے وہ پھر کرامات/معجزات کا انتظار کرتے ہیں اور انتظار کرتے کرتے فنا ہو جاتے ہیں۔

مورخ شاید یہ بھی لکھے کہ اس قوم نے خود محنت نہ کی بلکہ بیاّ کا گھر بھی توڑ دیا۔ جس نے کم ظرفوں کو دین کی تعلیم دے دی اور بدعقلوں کو دنیا کی۔ یہاں بھنورے میں پلے ہوئے لوگوں کو حکومت ملی جنھیں خبر ہی نہ ہوئی کہ کسی اور کا سچ بھی سچ ہوسکتا ہے ایک ایسا ملک تھا جہاں غریب کسمپرسی کی حالت میں کم ظرف کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہے۔ جہاں ہر کام کے لیے غریب کو دن میں ہزاروں سجدے کرنے پڑتے تھے۔ جہاں سچ بولنے کی زکوٰۃ تنہائی تھی۔ جہاں ٹھنڈے مزاج لوگوں کو بے غیرت کہا جاتا تھا، جہاں گناہ تکرار کے باعث عادت بن چکے تھے۔ جہاں علم بغیر تزکیئے کے پھیلا اور جہاں ذکر بغیر علم کے پروان چڑھا۔ ایک ایسی قوم جسے بے وقوفی اور حسنِ ظن میں فرق ہی پتہ نہ چل سکا اور ایک ایسی قوم جو سوا سو سالوں سے تصویر کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ ہی نہ کر سکی۔ ایک ایسی قوم جسے اللہ اڑسٹھ سالوں سے درگزر کرتا چلا آیا۔ جسکے ساتھ مالک کُل نباہ کرتا چلا آیا مگر اس نے نباہ نہ کی۔

اور مورخ شاید یہ بھی لکھے کہ جو قوم پولیو ویکسین پر فتویٰ لیتی تھی وہ اپنے مخالفوں کا قتل جائز سمجھتی تھی۔ ایک ایسی قوم جو اسکولوں کو بموں سے اُڑا دیا کرتی تھی اور جہاں عالم پڑھائی کو بے غیرتی کی وجہ بتاتے تھے۔ ایک ایسی قوم جہاں جھوٹ کی بیسیوں قسمیں تھیں۔ یہاں تک کہ جس شخص پہ تھوکنے کو دل نہ چاہے اس کی بھی خوشامد کریں۔

ایک قوم جس کو کہانیاں سنانے کا شوق تھا مگر عمل کا نہیں۔ جو سچی بات سے منہ پھیر لیتی تھی اور کبر کرتی تھی۔ جہاں حق گوئی قابل تعزیر جرم تھا اور جھوٹ بولنے والوں کی جے جے کار، جہاں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لوگوں نے بولنا اِس لیے سیکھا کہ باقی لوگوں کو بیوقوف بنا سکیں اور حدیث کی روشنی میں ملعون ٹھہرے۔

ایک ایسا ملک جہاں پانچ ہزار بچے سالانہ نالیوں اور کچرے کے ڈبّوں میں پھینک دیئے جاتے ہوں۔ چھ ہزار قتل ہو جاتے ہوں اور دس لاکھ ایف آئی آر کٹتی ہوں۔ پندرہ سو بچیوں کے ساتھ زنا بالجبر ہوتا ہو، اسّی کے ساتھ اجتماعی زیادتی ہو جاتی ہو۔ لوگ بچے بیچ کے پیٹ بھرتے ہوں اور ایمبولینس میں انتظار کرتا بیمار، صاحب کے گزر جانے تک لاش بن جاتا ہو۔ ایک ایسی قوم جو سال میں تین سو ارب بھتّے میں دے دیتی ہو اور پھر بھی خوف کے سائے میں جیتی ہو۔

اور آخر میں مورّخ شاید ایک نیا ترانہ بھی لکھے، اور یہ کہ یہ ترانہ آپ لیٹ کے سن سکتے ہیں کیونکہ اگر کھڑے ہونے کی قوت ہوتی تو اِس حال پہ پہنچتے ہی کیوں؟

لاالہ کے دیس میں
کشورِ حسین پر
المیہ ہی المیہ
پاک سرزمین پر

اہلِ زر کا راج ہے
جبر تخت و تاج ہے
ظلم کا سماج ہے
روگ لاعلاج ہے

ظلم کا یہ سِلسلہ
تاق ہے جبین پر
المیہ ہی المیہ
پاک سرزمین پر

خوف ہے ہراس ہے
تشنگی ہے پیاس ہے
چھت ہے نا لباس ہے
چور چور آس ہے

ہائے لٹ گیا یقین
مرکزِ یقین پر
المیہ ہی المیہ
پاک سرزمین پر

شہر ہے یا گوٹھ ہے
نظریوں کی اوٹ ہے
نیتوں میں کھوٹ ہے
ٹھوکریں ہیں چوٹ ہے

رہزنی کا ہو گمان
اپنے ہم نشین پر
المیہ ہی المیہ
پاک سرزمین پر

بھیڑیئے ہیں روبرو
بہہ رہا ہے کو بہ کو
اپنا خون جو بہ جو
تیر زن چہار سو

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سب کے سب جھپٹ پڑے
آج اہل دین پر
المیہ ہی المیہ
پاک سرزمین پر

لاالہ کے دیس میں
کشور حسین پر
المیہ ہی المیہ
پاک سرزمین پر

☆.....☆.....☆

مچھلی مارکیٹ

ہمارے معاشرے میں مچھلی مارکیٹ اپنے شور وغُل اور بدبو کی وجہ سے ہمیشہ سے مشہور رہی ہے۔
جب کلاس میں شور زیادہ ہوا اُستاد یہی کہتے تھے کہ کیا مچھلی مارکیٹ لگائی ہوئی ہے۔
مچھلی مارکیٹ کی اس تکرار اور اِستعارے نے عبداللہ کو مجبور کر دیا کہ وہ جا کے دیکھ کر آئے کہ فِش مارکیٹ ہوتی کیسی ہے؟ وہ اگلے ہی روز صبح صبح شہر کی سب سے بڑی فِش مارکیٹ کے بیچ و بیچ کھڑا تھا۔ انواع واقسام کی مچھلیاں، برف کی سیلوں کے بیچ، بڑے اچھے طریقے سے سجائی گئی تھیں۔
زیادہ تر مردہ تھیں تو معدودے چند پھڑک پھڑک کر اپنی جان ہار رہی تھیں اور اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے گاہکوں کی توجہ کا باعث بنی ہوئی تھیں۔
عبداللہ سوچنے لگا کہ کیا عجیب بات ہے، یہی مچھلیاں جب زندہ ہوتی ہیں تو ایک دوسرے کو کھا جاتی ہیں۔ اب مردہ ہیں تو سارے غم، شکوے بھلا کر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ پڑی ہیں، کھلی آنکھوں کے ساتھ۔

جب زندہ ہوتی ہیں تو دریا وسمندر کے پانی کو اپنا اصل گھر سمجھتی ہیں، پودوں اور زیرِ آب غاروں اور پتھروں کو اپنی دنیا مگر اِنہیں اِن کی معلوم دنیا سے باہر نکال کر، بنا سنوار کر کسی اور دنیا میں بیچا جا رہا ہے۔
انسان اور مچھلیوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ بھی زندہ ہوں تو دوسروں کو مارنے پر تُلے رہتے ہیں اور مر جائیں تو سارے گورے کالے، لمبے چھوٹے، دبلے موٹے، شیخ وسید، آرائیں و پٹھان، سندھی مہاجر، پشتون وسرائیکی ایک دوسرے کے شانہ بشانہ قبر میں لیٹے ہوتے ہیں۔
پھر مارکیٹ سجے گی، پھر بولی لگے گی، کچھ کو جنت کے فرشتے لے جائیں گے تو کچھ کو جہنم کے۔
اور کبھی کبھار تو یہ انسان جیتے جی مر جاتے ہیں۔ اپنے سینوں پر ڈگریوں اور تعلیم کے میڈلز سجائے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بازار میں بکنے آجاتے ہیں اور جو زیادہ بولی دے اس کے ہو جاتے ہیں۔ یہ سوچے بنا کہ اصل مارکیٹ تو کچھ اور ہے۔

عبداللہ کو اپنے من کا شور، مچھلی مارکیٹ سے زیادہ محسوس ہوا اور وہ خاموش مچھلی مارکیٹ سے اپنے کانوں میں انگلیاں دبائے بھاگتا ہوا گھر آ گیا۔

آج بھی اُسے جب کوئی مچھلی مارکیٹ نظر آتی ہے ایک جھرجھری سی جسم میں سرایت کر جاتی ہے۔

☆.....☆.....☆

مولوی صاحب

اللہ بخش چھ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، کچھ کُند ذہن تھا اور کچھ کام سے جی چُراتا تھا تو والدین نے سوچا کہ دنیا کے تو کسی کام کا ہونے سے رہا تو کیوں نہ راہِ خُدا میں لگا کر آخرت کا کچھ سامان کر لیا جائے۔ اور یوں اللہ بخش کو مدرسے میں ''جمع'' کروا دیا گیا کہ بوقت ضرورت کیش کیا جا سکے۔

گاؤں کے سارے لوگ اللہ بخش کو ''اللہ بخشے'' پُکارنے لگے کہ نام کا نام اور ساتھ میں دعا بھی دی جا سکے۔ کبھی کبھی نادانیوں کی جِست اُس مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ اہلِ ثروت تمنا ہی کر سکیں۔ بھولے بادشاہوں کو اتنا بھی نہیں پتہ کہ جب پُکار دعا بن جائے یا دعا پکار کا روپ دھار لے تو آدمی مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے۔

اللہ بخشے کو مولوی صاحب بنتے دیر نہ لگی۔ گاؤں کے وڈیروں کو جب اپنی رنگینیوں کی سنگینی کا احساس ہوتا تو وہ پچھتاوے میں خُدا کے نام پر بہت سا چندہ دے دیتے اور یوں گاہے بگاہے مدرسہ چلتا رہتا۔ پتہ نہیں مخلوقِ خدا کا خانہ برباد کر کے خانہ خدا آباد کرنے سے کیا ملتا ہے؟ اور گانے والی راتوں کا خمیازہ گانے والی نیکیوں سے (جنہیں گا گا کر لوگوں میں بیان کیا جا سکے) کیونکر پورا ہو؟

ایک دِن اللہ بخشے مولوی صاحب نے فحاشی اور ناچ گانے کے خلاف ایک خطبہ دے دیا تو اس کی پاداش میں گاؤں بدر قرار پائے۔

ایک بیوی، دو کم سن بچے اور بیروزگار مولوی صاحب وہ بھی ایک اجنبی شہر میں۔ کچھ دنوں کی فاقہ مستیوں کے بعد ایک پوش علاقے میں زیرِ تعمیر مسجد میں اِمامت کی جگہ پائی اور محلّہ کی مسجد کمیٹی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نے تنخواہ مقرر کی چھ ہزار سات سو روپے اور مسجد سے متصل ایک کمرہ نما گھر۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

امیروں کا علاقہ، امیروں کے بچے، امیر نمازی اور امیر ماحول میں مولوی صاحب واحد ٹاٹ کا پیوند تھے۔ ہر شخص مسجد کے آرائش وتزئین کا خواہاں اور کھلے دِل سے پیسہ لگانے کو تیار، مسجد کمیٹی کے ممبر (جو کہ ایک ریٹائرڈ میجر صاحب تھے) نے تو اپنا مستقل ٹھکانہ ہی جیسے مسجد کو بنا لیا تھا، ہر وقت مسجد کے کاموں میں جیسے زندگی تیاگ دی تھی، پتہ نہیں جوانی کے کارنامے تھے جن کی گونج سے قرار مسجد میں ملتا تھا یا شاید عمر کے ساتھ ساتھ ہر طلب ڈھل جاتی ہے، سوائے اللہ کی طلب کے اور یہ آگ ان کوئلوں میں بھی سلگتی ہے جو جلنے کے قابل بھی نہ رہیں۔

جہاں مسجد میں پیسوں اور عطیات کی ریل پیل ہو رہی تھی وہاں مولوی صاحب کو کھانے کے لالے پڑے رہتے۔ تنخواہ تھی ہی کتنی؟ غریب کی تنخواہ تو سوچنے میں ہی خرچ ہو جاتی ہے، خرچ کرنے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے۔ مولوی صاحب دِن رات مالی پریشانیوں میں گھرے رہتے اور نمازیوں کا فرمائشی پروگرام ختم نہیں ہوتا۔ میجر صاحب چاہتے کہ وہ ان کی ''معرکۃ الآرا'' تفسیر میں عربی کے کچھ جملے ڈال دیں، تو وِلایت پلٹ نمازی صاحب انہیں غاروں کے دور سے نکل کر انگریزی پڑھنے کا مشورہ دیتے، بیکری والے منیجر صاحب دورانِ نماز بچوں کے رونے کی آواز پر ٹوکتے، تو بینکر صاحب ظہر کی نماز مختصر کرنے پر زور دیتے۔

ایک آدھ بار مولوی صاحب نے مسجد کمیٹی میں تنخواہ کا مسئلہ اُٹھایا تو لوگوں نے صبر، قناعت اور آخرت پر نظر رکھنے کا مشورہ دیا۔ ایک صاحب نے خدا ترسی کے ناطے اپنے گھر پر بچوں کو قرآن پڑھانے رکھ لیا مگر یہ سلسلہ بھی چل نہ سکا، کہ کبھی بچوں کے امتحان ہوتے تو کبھی فیلڈ ٹرپ، کبھی گھر میں ایسے مہمان ہوتے کہ مولوی صاحب کا داخلہ ممنوع ہو جاتا تو کبھی بچے کھیل کھیل کر تھک گئے ہوتے۔ ہزار روپے ماہوار پہ نورانی قاعدہ پڑھانے والوں کی نظر میں لاکھ روپے ماہانہ اسکول فیس اور انگریزی لٹریچر کی وقعت اور موازنہ تو صاف ظاہر تھا۔

ایک صاحب جن کا فلم کی ڈی وی ڈیز کا کاروبار تھا ایک عرصے سے مولوی صاحب سے کہہ رہے تھے کہ آپ دو وقت کا کھانا ہمارے گھر سے لے جایا کریں مگر مولوی صاحب کو تو حلال وحرام کے فلسفوں سے فرصت ملے تو کچھ سوچیں نا۔ ایک دن پیٹ کا پتھر دِل پر رکھ کر ہاتھ میں جِست کا ٹفن اُٹھائے وہ مووی والی دکان کی اُپری منزل میں گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔

دروازہ کھُلتے ہی ایک فحش گانے کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ مولوی صاحب نے کانپتے ہاتھوں سے ٹفن دروازہ کھولنے والی خاتون کے ہاتھ میں دِیا۔ جب تک وہ خدا کے نام پر کھانا ڈال کر واپس لاتیں خُدا کا بندہ جا چُکا تھا۔

اُس دن کے بعد سے مولوی صاحب یا اُن کے بیوی بچوں کو کسی نے نہیں دیکھا۔ اگلے روز مووی والے کی دُکان میں مسجد کا اشتہار لگا ہوا تھا۔ اِمام مسجد کی آسامی خالی ہے، شاندار تنخواہ اور دو وقت کا کھانا مفت۔

''ضرورت مند'' حضرات نیچے دیئے گئے نمبر پر رابطہ کریں۔

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بنیاد

سر جی، میں اچھی جاب کرنا چاہتا ہوں؟ انٹرویو میں آئے اُمیدوار نے عبداللہ سے کہا۔

اچھی جاب کی تشریح کرو۔ عبداللہ نے سوال پوچھا۔

جی، بس وہی کہ جس میں نام ملے، پیسہ ملے، کوئی ایک آدھ باہر ملک کا چکر، سالانہ بونس اور پروموشن۔ بس زیادہ کچھ نہیں۔

ٹھیک ہے، مگر کل مجھے آپ سے اچھا بندہ مل گیا پھر؟ کمپنی کا فائدہ اسی میں ہے کہ آپ کو نکال کے اسے رکھ لیں۔ تو آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟

جی، ایسے کیسے ہوگا؟ میں ہی سب سے بہتر ہوں۔ اگر آپکے ایسے ارادے ہیں تو پہلے سے بتا دیں میں ابھی جس کمپنی میں ہوں وہاں میری من چاہی ساری چیزیں مل رہی ہیں۔

اور وہ بھی پچھلے چار سالوں سے۔

پھر بھی آپ وہ جاب چھوڑ کر یہاں آنا چاہتے ہیں؟

جی وہ، یہاں نام زیادہ ہوگا۔ امریکن کمپنی ہے نا!

جی آپ جا سکتے ہیں۔ عبداللہ نے اُمیدوار کو تو فارغ کر دیا مگر وہ نجانے کون سی سوچوں میں گھِرتا چلا گیا۔

وہ سوچنے لگا کہ دنیا کو بدل دینے کے دعوے کرنے والے، انسانیت کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کے خواہش مند، اور ملک اور اُمت کی نشاۃِ ثانیہ کے خوابوں کی تعبیر کے سپہ سالار کب اپنی ذات کے مدار سے باہر نکلیں گے اور کب ایسے اداروں پر کام کرینگے جن کی بنیادیں مضبوط ہوں۔

ہر شخص گنبد کا پتھر بننا چاہتا ہے جس پر سب کی نظر پڑے۔ بنیاد کا نہیں کہ جسے کوئی نہ دیکھے۔ مگر ربّ تو سب کچھ دیکھتا ہے۔ سب کو دیکھتا ہے۔

عشق عشق کی ضد ہے۔ ایک سے کرو تو دوسرے کو چھوڑنا ہی پڑتا ہے، یا چھڑوا دیا جاتا ہے۔ بامقصد زندگی گزارنے کا دعویٰ کرنے والوں کو بیلنس لائف کا رونا نہیں رونا چاہئے۔ بیلنس لائف تو وہاں ممکن ہو جہاں معاشرے میں ہر کوئی اپنے حصّے کا کام کر رہا ہو یا کم از کم انصاف اور امن تو ہو۔ جہاں ایک ایک شخص کو پورے پورے اِداروں کا اور پوری پوری نسلوں کی آبیاری کا کام کرنا پڑے وہاں زندگی تیاگنی ہی پڑتی ہے۔ وہاں بیلنس لائف ممکن نہیں۔ جب تک آدمی کو رات کی تاریکی دن کی سفیدی میں تبدیل کرنا نہ آئے نصیبوں کی تاریکیاں دور نہیں ہوتیں۔

اور جو بنیادیں ہوتی ہیں وہ مضبوط ہوتی ہیں خوبصورت نہیں۔ ان کو خوبصورت بنانے کے چکر میں وقت اور انرجی برباد نہیں کرنے چاہئیں۔ جس شخص کا نظریہ آپکے نظریے سے متصادم ہو وہ بنیاد میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا اگر چاہے بھی تو۔

بنیادوں میں اختلافِ رائے کا احترام نہیں کرنا چاہئے۔ بچھو کے بچے پر رحم کھانا آدم کے بچے کو ہلاک کروا دیتا ہے۔ اگر کوئی آپ کے مزاج و مقصد کے مطابق نہیں تو اسے شروع سے ہی الگ کر دینا چاہئے تاکہ وہ اپنی منزل پا سکے اور آپ کی بنیادوں میں رخنہ بھی نہ پڑے۔

وہ لوگ ہی اور ہوتے ہیں جن سے بنیادوں کا کام لیا جاتا ہے۔ خدا جب کسی کو چُن لے تو اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور اُسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ ان بنیادوں میں پھر ایسے شخص کا خون، دولت، عزت، نام سب چلی جاتی ہیں پھر کہیں جا کر ادارے بنتے ہیں۔

جس شخص کو فیلڈ کی اِمامت دی جانی ہو اسے پہلے لوگوں کے پیروں تلے روند دیا جاتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ سر جھکا کر کام کرتا رہے۔ دعویٰ دلیل مانگتا ہے۔ قدرت کا قانون ہے جتنا بڑا دعویٰ اُتنی ہی بڑی دلیل۔ آدمی کو چاہئے کہ اپنے آپ پر کام کرتا رہے۔ غلطی ہو بھی جائے تو بس معافی مانگ لے اور پھر جُت جائے اُسی کام میں۔ کائنات میں سب سے زیادہ تعریف پر خوش ہونیوالا اللہ ہے اور سب سے جلدی معذرت قبول کرنے والا بھی وہی ہے۔ بندہ معذرت کر لے اور کوشش کرے کہ انفرادی نقائص اجتماعی بگاڑ نہ بنیں۔ جب اجتماعیت بگاڑ کا شکار ہو جائے تو افراد کی نہیں سنی جاتی۔ قدرت کبھی بھی پہلی بار میں رسوا نہیں کرواتی۔ گناہ جب تکرار سے عادت بن جائے تو پکڑ کی سبیل ہو۔ پہلی بار تو قدرت خود رجوع کا انتظار کرتی ہے۔ نفس پر نگاہ رکھنی چاہئے یہ کائنات کی واحد مخلوق ہے جو بیمار ہو تو پھلے پھولے اور صحتمند ہو تو مر جاوے۔

جو لوگ بنیادیں رکھتے ہیں وہ قربانی کے وقت آگے آگے ہوتے ہیں اور انعامات کے وقت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پیچھے اور چپ چاپ اپنا کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ دنیا کو تو سالوں اور کبھی کبھار صدیوں بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ کیا کر گئے۔

کسی سے تعریف کی توقع نہ رکھیں۔ بڑی کم ظرفی کی بات ہے کہ کام خالق کیلئے کریں اور صلہ مخلوق سے چاہیں۔ جس ملک میں لوگ تنقید و تنقیص کا فرق نہ سمجھ پائیں وہاں مشورہ لینا اور دینا دونوں ہی کارِ زحمت ہیں۔ حاسدوں سے نہ ڈریں۔ جو کام اللہ کیلئے ہو وہ غاصبوں کیلئے آگ ہوتا ہے۔

بس کام کرتے رہیں اور کرتے رہیں۔ آخر میں عبدیت، دعا اور حیرت باقی رہ جائیگی۔ عشق بیچارہ تو عبدیت میں گم ہو جاتا ہے۔ اور وہ بنیادیں جو عبدیت سے جنم لیتی ہیں اُنھیں معبود خود قائم رکھتا ہے۔

☆.....☆.....☆

ماحولیاتی آلودگی

ڈاکٹر نسرین عابد کا شمار ملک کی چیدہ چیدہ خواتین میں ہوتا تھا۔ وِلایت سے ماحولیاتی انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ کرنے والی ملک کی شاید واحد خاتون تھیں اور ملک میں ماحولیاتی آلودگی پر کام کرنے والی سب سے بڑی NGO کی روحِ رواں۔

اُن کا چلنا پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا صرف وصرف ایک ہی فکر کے گرد تھا اور وہ تھی کہ کس طرح ملک عزیز کو ماحولیاتی آلودگی، گلوبل وارمنگ اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کی خانہ خرابیوں سے بچایا جا سکے۔ اِس موضوع پر کوئی پروگرام، کوئی انٹرویو، کوئی مذاکرہ، کوئی کانفرنس اور شوا ایسا نہ تھا جو ان کی موجودگی کے بغیر مکمل سمجھا جا سکتا۔ اللہ نے بولنے کا فن بھی خوب دیا تھا۔

جب زندگی ماحول کی فکر میں تیاگ دی تو گھریلو کام کاج کے لئے نوکروں کی ضرورت پیش آئی۔ صنوبر ایک گیارہ سالہ بچی تھی جو ایک دارالامان میں ابھی تک بچی ہوئی تھی جو ڈاکٹر صاحبہ کی ایک دوست نے انہیں محبتاً گفٹ کر دی اور دنیا داری کو کسی مسکین غریب بچی کی کفالت کا سہرا الگ حصے میں آیا۔

صنوبر کو اپنی نئی مالکہ کا کام اور تقاریر بڑی پسند آتیں، وہ پوری شدت کے ساتھ اُن کی سچائی کی شہادت دیتی۔

ماحول آخر آلودہ ہی تو ہے، نظریں آلودہ ہیں جو اُس کے کم سن بدن کے آر پار ہو جاتی ہیں، لوگ آلودہ ہیں جو اس کے جسم کا طواف کرتے رہتے ہیں اور سبزی کی خریداری کے دوران اسے چُھو کر نجانے کون کون سے گناہوں کا ازالہ کرتے ہیں۔ مزاج آلودہ ہو گئے، رویّے اور ارادے آلودہ ہو گئے۔

خانقاہوں کے چراغ آلودہ ہو گئے، مسجدوں کے مینار آلودہ ہو گئے، منصفوں کا انصاف،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

راہبروں کی رہبری، منزلوں کے نشان، میاں بیوی کی محبت، اولادوں کی خدمت، گواہوں کے بیان، مفتی کے فتاویٰ، مولوی کا بیان، شیخ کی کرامات، مرید کے حالات، مالدار کا پیسہ، عورت کا حُسن اور بندے کی بندگی سب کچھ ہی تو آلودہ ہو گئے، ٹھیک کہا ڈاکٹر صاحبہ، حق ہے، صنوبر ماحولیاتی آلودگی کی اپنی ہی تعریف کرتی رہتی۔ دِل بینا ہو تو آنکھ کا کام صرف خوبصورتی میں اضافہ ہی رہ جاتا ہے۔ اور صنوبر کو گلوبل وارمنگ پر بھی پورا یقین تھا۔ حدّت میں اضافہ اظہر من الشّمس تھا۔ جذبات کی حِدّت، جسموں کی گرمی، کلام کی تپش، رویّوں کی آنچ اور رشتوں کی دہک، اس کو سبھی تو محسوس ہوتے۔ اُسے لگتا اس کا اپنا حسن، اپنے ہی جسم کی حدّت میں جل کر راکھ ہو جائے گا۔

اِدھر ڈاکٹر صاحبہ کے بیرون ملک دورے طویل ہوتے چلے گئے اور اِدھر اُن کے شوہر کی صنوبر کے ساتھ دست برداریاں، آج تو پیشرفت میں حد ہی ہو گئی۔ صنوبر نے بمشکل تمام اپنی عزت بچائی اور بھاگ کر پُل سے چھلانگ لگا کر دریا میں خودکشی کر لی۔ 3 دن بعد لاش ملی تو جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور پھول کر کُپا ہو گئی تھی۔ تعفن اتنا کہ کوئی اپنا پاس نہ جائے تو خیراتی ادارے والے کہاں ہمت کریں۔ جیسے تیسے کفن دے کر سُپرد خاک کیا۔

ڈاکٹر صاحبہ کی واپسی پر صنوبر کی موت کا واقعہ بجلی بن کر گرا، وہ تڑپ کر کہنے لگیں کہ ساری آنتیں اور خون دریا کے پانی میں مل گیا ہو گا، میرا بس چلے تو دریا میں خودکشی کے ارادے پر الیکٹرک چیئر پر مروا دوں۔ یونو کتنی ماحولیاتی آلودگی ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

محبت

آج دنیا بھری پڑی ہے، محبت کے دعوے، محبت کی رسمیں، محبت کے وعدے، محبت کے فتنے اور محبت کی باتوں سے۔ مگر کبھی کبھی دل میں خیال آتا ہے کہ کیا محبت کا کوئی وجود بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ کیا یہ واقعی کہیں پائی بھی جاتی ہے؟ کیا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی محبوب کے لئے محبت تیاگ دے؟ چھوڑ دے اپنی مرضی اور مان لے جو محبوب چاہتا ہے۔ چل پڑے اس راہ پر جہاں محبوب موجود ہے۔

محبت کی تعریف کیا ہو؟ رقیب کون ہو؟ مثال کیا ہو؟

مجھے نہیں لگتا کہ اب محبت کی کوئی خالص قسم دنیا میں باقی بچی ہے۔ انسانوں میں تو کم از کم نہیں۔ اور محبت کی تعریف تو شاید ممکن بھی نہیں۔ یہ تو محبت ہے جو انسان کو ڈیفائن کرتی ہے نا کہ انسان محبت کو۔

آپ یقیناً میری باتوں سے اختلاف کر رہے ہونگے اور پتہ نہیں کون کون سی مثالیں آپکے ذہن میں گردش کر رہی ہونگی مگر کیا ہم ان مثالوں کو محبت کی کسوٹی پر پرکھ پائیں گے؟ محبت چھوڑ دیتی ہے، محبت روند دیتی ہے، محبت جلا ڈالتی ہے، محبت مار دیتی ہے اور اسے کوئی فکر نہیں ہوتی کہ کیا ہوا۔ محبت جِلا بخشتی ہے۔ نم آنکھوں سے آغاز لینے والی محبت کی معراج بندگی ہے۔ ایک چُپ ہے جو تکتی رہتی ہے کہ کب دروازہ کھلے، کب دیدار ہو، کب وہ پوچھیں، کب وہ نام لیں، کب وہ خوش ہو جائیں، کب وہ مَن جائیں اور کب وہ کہہ دیں کہ جا راضی ہوا۔

محبت کی ضد نفرت تھوڑا ہی ہے۔ نفرت تو ایک حیوانی جذبہ ہے۔ یہ حسد کی ماں ہے۔ انسانوں میں بھلا اِس کا کیا کام؟ محبت کی ضد تو آزادی ہے۔ محبت میں آدمی قید ہی تو ہوتا ہے۔ جو محبوب چاہے، جب چاہے، جیسے چاہے، جہاں چاہے وہاں حاضری دینی ہی پڑتی ہے۔ نہ اپنی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مرضی چلے نہ خواہش بلکہ اِن کا اُلٹ ہی کرنا پڑتا ہے۔ محبت میں آنکھیں ترجمہ کرتی ہیں معنی دل پہناتا ہے اور ذہن وگمان کی کسک کو وجود بخشتا ہے۔

محبت میں سب سے بڑا رقیب نفس ہے۔ یہ نہیں ملنے دیتا محبوب سے اور انسان نادانی میں اِس سے ہی محبت کر بیٹھتا ہے پھر جو چاہے آجائے جیت نفس کی ہی ہوتی ہے۔

ماں باپ محبت کرتے ہیں اپنی اولادوں سے۔

جی ٹھیک کہا آپ نے، کبھی کرتے ہونگے یا شاید وقتی طور پر۔ ماں باپ آپکے پیدا ہونے پر خوشیاں مناتے ہیں۔ آپکو کھلاتے پلاتے ہیں۔ آپ کا نام رکھتے ہیں، اچھے برے میں خیال رکھتے ہیں۔ مگر جب آپ بڑے ہو جاتے ہیں تو انہیں اپنے ہر اچھے کرم کا حساب چاہئے ہوتا ہے۔ ایک گھر میں ایک ہی والدین کی چار اولادیں۔ جو پیسہ کمائے، وہ پیارا اس کی بیوی بھی اور بچے بھی اور جو کسی قابل نہ ہو پائے اسکی عزت گھر کے نوکر سے بھی گئی۔ غصّہ آئے تو عاق کر دیں، گھر سے نکال دیں۔ اور بھلا یہ کیسی محبت کہ دنیا بنانے کا سامان کر دیا مگر اِسی اولاد کی آخرت کی کوئی فکر نہیں؟ کیا فرق رہ گیا بچے پالنے میں اور فیکٹری لگانے میں؟

جو کام بدلے کی نیت سے کیا جائے بھلا وہ بھی محبت میں شمار ہو سکتا ہے؟

حکمرانوں کو اپنی عوام سے محبت ہے۔

جی خوب کہا۔ جس ملک میں غریب کے بچے کچرے کے ڈھیر پر رزق کے لئے کتوں سے لڑیں وہاں پوری صداقت سے آپکی بات کا یقین ہو ہی جاتا ہے۔ جس ملک میں گناہ وثواب، نیکی وبدی، سزا وجزا کا گمان تک مر گیا ہو وہاں ایسے جملے بولنا تہذیب کی عصمت دری کے برابر ہیں۔

اَجی چھوڑیئے یہ باتیں، بیوی آخر شوہر سے محبت کرتی ہی ہے اسی لئے تو اپنا میکہ چھوڑ کے چلی آتی ہے۔

جی بھائی، صحیح کہا آپ نے۔ سالوں کی رفاقتوں کے بعد ایک جملہ غلط نکل جائے، ایک دن برا گزر جائے، آمدنی کم ہو جائے، بیماری آجائے، توجہ کہیں اور لگ جائے۔ یہی بیوی کہتی ہے کہ میں نے آج تک سکھ کی کوئی گھڑی نہ دیکھی۔ بچے اُٹھائے اور یہ جا وہ جا۔ اب شوہر بیچارہ مناتا پھرے۔ یہی حال خاوند حضرات کا ہے۔ حسن زائل ہو جائے، بیماری آجائے یا بات میں سختی ہو جائے تو وہ اِسے چھوڑ اوروں کی تمنا کریں۔ پا سکیں یا نہیں، تمنائیں تو روز مچلتی ہیں۔ تُف ہے ایسی محبت پر۔ محبوب کے سامنے کسی اور کا خیال بھی آجائے تو یہ محبت میں شرک ہے اور یہاں ایسے

بھی کہ گھنٹوں محبوب کے سامنے کھڑے اور بیٹھے دلوں میں کسی اور کے خیال سجائے بیٹھے ہیں اور پھر دعوی محبت کا۔ واہ بھئی واہ۔ کیا معصومیت ہے۔

چلیں یہ تو مانیں گے کہ لڑکے کو لڑکی سے محبت ہو سکتی ہے یا یہ بھی نہیں۔

یہ بھی اچھی کہی۔ رات رات بھر کے نائٹ پیکجز، گھنٹوں باتیں، ساتھ جینے مرنے کی قسمیں، زندگی نبھانے کے وعدے، مگر شادی ہو جائے تو؟ اب یہی نائٹ پیکجز، وعدے اور قسمیں کہیں اور؟ کیا آپکو یقین ہے کہ یہ محبت ہی تھی یا کوئی جسمانی طلب؟ آج کل کی محبتوں کا نشہ تو چھ ماہ میں ہی اُتر جاتا ہے۔

چلیں، آپ تو کوئی مولوی صاحب لگتے ہیں، اللہ کے لئے تو بندہ محبت کرتا ہی ہے۔

جی صحیح کہا آپ نے۔ لوگ پتہ نہیں بندوں سے اللہ کے لئے محبت کا دعوی کیسے کر لیتے ہیں مجھے تو آج تک اللہ سے اللہ کے لئے محبت نہ ہو سکی۔ اور سونے پہ سہاگہ، بندوں سے اللہ کے لئے ناراض بھی ہو جاتے ہیں، قطع تعلق بھی کر لیتے ہیں۔ اگر اللہ نے کہہ دیا کہ جس سے تم تمام عمر میرے نام پر ناراض رہے اسے تو میں نے بخش دیا تھا تو پھر؟ مجھے لگتا ہے کہ محبت صرف یک طرفہ ہوتی ہے۔ دوطرفہ تو بزنس ہوتا ہے۔

اور جو بندہ اللہ سے محبت کرتا ہے، اس کا کیا؟

جی، وہ تو اچھی بات ہے کرنی بھی چاہئے۔ اللہ جلاّ جلالہٗ کا حق بنتا ہے مگر سیانے کہتے ہیں کہ محبت وہ خوشبو ہے جو چھپائے نہیں چھپتی۔ یہ آنکھوں، چہروں اور رویوں میں نظر آنے لگتی ہے۔ دلوں پہ راج کرتی ہے، ذہنوں میں گونجتی ہے اور شخصیت کو نکھار دیتی ہے۔ تو پھر وہ محبت جو ہم اللہ سے کرنے کا دعوی کرتے ہیں یہ آنکھوں میں کیوں نہیں چمکتی؟ نہ چہروں پر دمکتی ہے، نہ سانسوں میں دہکتی ہے، نہ دلوں پر راج کرتی ہے، نہ خوشبو پھیلاتی ہے، نہ شخصیت میں بہار لاتی ہے، نہ راتوں کو رُلاتی ہے، نہ لہجوں میں سلگتی ہے، نہ طبیعت میں مچلتی ہے۔ نہ نیندوں سے اُٹھاتی ہے۔ نہ سوتوں کو جگاتی ہے، نہ ہی اعمال بدلتی ہے، نہ ہی سر چڑھ کے بولتی ہے، نہ ہی کہیں رکھ چھوڑتی ہے، نہ ہی ہجرت کراتی ہے، نہ ہی آس دلاتی ہے، نہ ہی رب سے ملاتی ہے۔ ایسی خالی خولی بے اثر محبت کو بھلا کون محبت مانے؟

مجھے تو نظر نہیں آسکی آپ کی یہ محبت، اگر آپ کے پاس کوئی اور مثال یا ثبوت ہو تو پیش کریں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جہاں تک رہی اپنی بات، میں تو محبت کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہوں اس کی بارگاہ میں، جو تمنّا دیکھ کے مراد بر لاتا ہے۔ کیا پتہ کب اِس بہروپیئے کو اصل کر دے۔

☆.....☆.....☆

منگتا

مانگنے کا دعوی ہر کوئی کرتا ہے۔ مانگنے کی رسم ہم روز نماز کے بعد نبھاتے ہیں۔ مانگنے کی تعلیم سب دیتے ہیں، مانگتا ہر کوئی ہے مگر منگتا کوئی کوئی ہوتا ہے۔ شاید لاکھوں میں ایک۔

منگتا وہ ہوتا ہے جسے مانگنا آ جائے اور اب ایسے لوگ نایاب ہو گئے۔ مانگنا عبادت کا انعام نہیں اور نہ ہی کوئی اختتامی طرزِ عمل ہے جو عبادت کی تکمیل کرے۔ مانگنا تو بذاتِ خود ایک عبادت ہے۔ منگتا وہ ہے جسے مانگنے میں لذت ملے، جسے مانگنے کے سوا کوئی کام ہی نہ رہے۔ وہ چلتا پھرتا، جیتا جاگتا، اٹھتا بیٹھتا، بولتا اور چپ سراپا مانگ ہو۔ جو بولے تو مانگے، چپ ہو تو مانگے۔

اس کی چپ خدا کی چپ سے باتیں کرے، وہ ہاتھ اُٹھائے تو دعائیں دوڑتی ہوئی آئیں اور اسکے ہاتھوں کے بوسے لے۔ منگتا وہ ہے جو فقیر ہو بھکاری نہیں۔ بھکاری سب سے مانگتا ہے فقیر ایک سے۔ منگتے سے بڑا فقیر شہر میں کوئی نہیں ہوتا وہ بس ہر وقت جھولی پھیلائے مانگتا ہی رہتا ہے اور اسے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کچھ ملے یا سب کچھ مل جائے۔ اُس کی منتیں بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں جو ملا دے دیا، جو پایا بانٹ دیا، جو عطا ہوا لٹا دیا اور پھر وہی فقیر پھر وہی منگتا۔

جب مانگنے کی لذت مراد سے بڑھ جائے، عرضی کا حسن عطا سے سِوا ہو، سوال کی چاشنی جواب سے آگے نکل جائے، جب فرشتے دلوں میں مانگ پھونکیں اور اُٹھتے ہوئے ہاتھوں پہ آمین کہیں، جب اللہ بندے کی طرف یوں آئے جیسے ماں اپنے بچے کی طرف جب وہ پہلی بار ماں پکارتا ہے، جب دل کی پہنچ عقل کو پیچھے چھوڑ جائے، جب تخیل کی پرواز ذاتِ الٰہی کا طواف کرے۔ پھر کوئی بنے ہے منگتا۔

منگتا جب چپ ہو جائے تو قدرت صدا لگاتی ہے کہ مانگو اور جب وہ گویا ہو تو قدرت سب کو چپ کرا دے کہ سنو۔ جب یہ روئے تو قدرت کہے اک بار مسکرا دو۔ یہ ایک ایسا مانگنے والا ہوتا ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جسے خالی جانا منظور نہیں ہوتا، اس کا دل دھونکنی بن جاتا ہے، ایسی گھٹی گھٹی آوازیں نکالتا ہے کہ موت کا گمان ہو۔ اسے اپنے مالک پہ یقین ہوتا ہے کہ دعا قبول ہو کے رہے گی۔ وہ کاتب سے قلم و صفحات مانگ لیتا ہے اور پھر بغیر لکھے واپس کر دیتا ہے۔

یہ منگتا مانگنے پر آئے تو خدا کو خدا سے مانگ لے۔ یہ اسے مانگتا ہے جو سب کو دیتا ہے۔ یہ نور سے نور مانگتا ہے، رنگ سے رنگ مانگتا ہے، تجلی سے تجلی مانگتا ہے اور اپنی مانگ کی تپش میں خود ہی جل کر خاک ہو جاتا ہے۔

سات ارب کی دنیا میں ان کا کوئی نہیں ہوتا۔ کوئی ہاتھ اِن کے لئے نہیں اُٹھتا۔ یہ رات کے اندھیروں میں ربِ کائنات سے سب کے لئے دعا مانگ کر، سب کے صدقے سے اپنے لئے منگتے کی پوسٹ مانگ لیتے ہیں۔ مانگنا نشہ بن کے اِن کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ ان کا خدا کے سوا، خدا کی قسم کوئی نہیں ہوتا۔ اپنا آپ بھی نہیں۔ ان کا دل مالک کے نشے میں ایسا ڈوبا ہوتا ہے کہ اپنا وجود تک نہیں پہچان پاتا کہ کس جسم کی قید میں دھڑکتا ہے۔

ایسے بندے کو کبھی نہیں تنگ کرنا چاہیئے جس کا اللہ کے سوا کوئی نہ ہو۔ یہ دیوانے دنیا لٹا کر بھی ہنستے رہتے ہیں۔ کوئی مقابلہ کرے تو کیسے۔ منگتے اپنی مراد کسی اور کو دے کر ذکر کی لذت مانگ لیتے ہیں۔ دنیا انہیں حقیر جان کر دھتکارتی ہے، طعنے دیتی ہے، بددعائیں دیتی ہے، کافر و ملحد پکارتی ہے۔ یہ سب سنتے ہیں مگر چپ رہتے ہیں کہ رات تو آنی ہے، سورج تو ڈوبے گا، تاریکی تو چھائے گی، ہاتھ تو اُٹھیں گے، پھر دیکھتے ہیں کون منگتا بنے تو کون مانگ۔ کس کو دنیا ملے تو کس کو دنیا بنانے والا۔

☆.....☆.....☆

ناجائز

کچرے کا ڈبہ اور گھنگرو۔ یہ دو یادیں تھیں اس کے بچپن کی اور کچھ یاد نہیں رہا۔ تیرہ سال کا اصغر ہمیشہ اسی معمے میں رہا کہ وہ تھا کون؟ آیا کہاں سے؟ ماں کون تھی؟ باپ کون تھا؟ ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو کچرے کے ڈبوں کے بیچ پایا، روز باقی آوارہ بچوں اور کتوں سے چھین کر روٹی کھانا اس کی زندگی کا واحد مقصد ٹھہرا۔ ہاں البتہ اگر کبھی کسی پاس سے جاتی گاڑی یا بس سے میوزک کی آواز آتی تو اس کے دماغ میں گھنگرو بجنے لگتے۔ پتہ نہیں کیوں؟ یہ آواز اس نے کہاں اور کیونکر سنی تھی۔ کچھ یاد نہیں پڑتا تھا۔ ایک موٹی سی آنٹی کہتی تھیں کہ اس کی ماں کنجری تھی تو وہ بھی کنجر ہو گیا۔ مگر اسے تو کچھ یاد نہیں تھا، ماں کیسی ہوتی ہے؟ کیسی دکھتی ہے، کیسے پیار کرتی ہے؟ ماں تو ماں ہوتی ہے مگر پھر وہ کچرے کا ڈبہ، وہ گھنگرو اور کچھ یاد آتا ہی نہیں تھا۔

کچرے میں ملنے والی کاپی، کتابوں اور پنسل سے وہ کچھ کچھ پڑھنا سیکھ گیا تھا، شام کو وہ پاس والی کوٹھی میں کتوں کی رکھوالی اور انہیں کھلانے پلانے جاتا تو وہاں چوکیدار سے بھی کچھ نہ کچھ پڑھ لیتا۔ صاحب جی غصے کے تیز تھے مگر عموماً ملک سے باہر ہی رہتے۔ ان کی سیکرٹری اُن کے ساتھ ہی جاتیں۔ میم صاحب یوں تو خوب گھریلو خاتون تھیں مگر صاحب کے جاتے ہی ان کا وقت اپنے دوستوں کے ساتھ ہی گزرتا، دن بھی اور رات بھی۔ چھوٹے کے ذمہ داری کتوں اور کتوں کی مالک صاحب جی کی بیٹی پر آتی۔

صاحب جی کی بیٹی، جنھیں وہ چھوٹی میم صاحب پکارتا، کا اٹھنا بیٹھنا شریف لڑکوں میں نہ تھا۔ خیر شریف کی تعریف تو امیر ہی کرتے ہیں مگر چھوٹے کو ڈانس کرنے والے شراب میں دھت لوگ شریف نہ لگتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی مہینوں سے چل رہا تھا، اسے ان سب کا گھلنا ملنا عجیب سا لگتا۔ ایک انوکھی بے چینی ہوتی مگر وہ اسے نام نہ دے پاتا۔ پھر اچانک یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ بڑی میم صاحب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چھوٹی میم صاحب کے ساتھ کہیں چلی گئیں۔ ایک رات ان کا ڈرائیور چھوٹے کی جھگی میں آیا اور اُسے ساتھ لے گیا۔

چھوٹا جب واپس آیا تو اس کی گود میں سات دن کی بچی تھی اور جیب میں ڈھیر سارے نوٹ۔ وہ خوشی سے کبھی نوٹوں کو دیکھتا تو کبھی اس معصوم سی بچی کو۔ اسے بڑی خوشی تھی کہ اب کچھ روز تو کم از کم کتوں سے چھین کر نہیں کھانا پڑیگا۔

آج وہ سونے کے لئے لیٹا تو ایسا لگا جیسے کہ اسکی یاداشت واپس آ گئی ہو اس نے وہیں کچرے کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے دعا کو ہاتھ اُٹھائے۔

اے مالکِ دو جہاں، یا ذوالجلالِ ولاکرام، تو تو سب کا خدا ہے۔ ان پہ رحم کر جو دوسروں کی بھول سے کنجر کہلائے۔ اُن پہ رحم کر جو بے قصور دھتکارے گئے، انھیں اَمان دے جنھیں امان والوں نے بے امان کر دیا۔ ان پہ کرم کر جن کے کانوں سے گھنگرو کی گونج چمٹ جائے۔ اِس بچی کا خیال رکھ اور مجھے ہمت دے کہ اب دو کتوں سے کھانا چھیننا پڑے گا۔ تو سارے نیکوں کی سنتا ہے آج ہم جیسوں کی بھی سن لے، کنجر ہی سہی تیرے پاس نہ آئیں تو جائیں کہاں؟ آج ان کی لاج رکھ جن کی کوئی لاج نہیں۔ آمین

اگلے دن جھگیوں میں میلے کا سماں تھا۔ ہر کوئی نئی ''کنجری'' دیکھنے آ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

تلاشِ گمشدہ

ایک میلے کا سماں تھا، حدِ نظر پھیلے ہوئے میدان میں قطار اندر قطار خیموں اور اِسٹالوں کی دنیا آباد تھی۔ یہ میلہ دنیا بھر کے متمول ترین آدمیوں نے لگایا تھا۔ دنیا کی آبادی کا اعشاریہ سات فیصد جن کے پاس دنیا کی 41 فیصد دولت ہے، نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر کسی شخص کی کوئی چیز گم ہوگئی ہے اور اس کا ثبوت اس کے پاس ہے تو وہ یہاں سے آ کر لے جائے۔ ایک دن کی اِس کاوش کا مقصد لوگوں میں خوشیاں بانٹنا تھا۔

دنیا بھر سے لوگ آئے ہوئے تھے کوئی اپنی گاڑی مانگ رہا تھا تو کوئی سونے کی انگوٹھی، کوئی گمشدہ نیکلس تو کوئی پرانا گٹار۔ ایک عورت تو اپنے گمشدہ بچے کی تصویر لے کر آ گئی جسے وہاں موجود ٹیم نے دنیا بھر کے ٹی وی پر چلا دیا اور دنیا بھر کے قانون نافذ کرنے والے اداروں تک پہنچا دیا اس اُمید پر کہ کوئی نہ کوئی خبر ضرور آ جائے گی۔

تمام لوگ لائن میں اطمینان سے کھڑے تھے اپنے نمبر کی اناؤنسمنٹ کے انتظار میں۔ بہت سوں کو تو پروف کے بعد ان کی پرانی چیزوں کے بدلے نئی دے دی گئیں کہ مقصد خوشیاں پھیلانا ہی تو تھا۔ اِس جمِ غفیر میں صرف ایک عبداللہ تھا جو حیران و پریشان کھڑا تھا۔ ہر شخص کو اپنی گمشدہ ملکیت کے مل جانے کا یقین تھا سوائے عبداللہ کے۔ خیر کچھ دیر بعد عبداللہ کا نمبر بھی آ گیا۔

جی، آپ کا کیا گم ہو گیا ہے؟ ہم پوری کوشش کریں گے کہ آپ یہاں سے جائیں تو آپکی گمشدہ اِملاک آپکے ہاتھوں میں اور مسکراہٹ چہرے پر ہو۔ میزبان نے روائتی جملہ دہراتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

جی میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کیسے دیں گے؟

آپ چھوڑیں اِن باتوں کو، ہمارے پاس دنیا کے پچاس فیصد وسائل ہیں، آپ عرض کریں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کھویا کیا ہے؟

جی میں مسلمان ہوں۔

ہماری اقدار کھو گئی ہیں، معاشرت بھی، معاشی نظام بھی، حکومتی چال چلن بھی، سچائی، دیانتداری، محنت اور کام کرنے کی عادت بھی، نفع بخشنے کی صفت بھی، معاف کر دینے کا حوصلہ بھی، ایثار کی مثال بھی، ذکر کی کیفیت بھی، مالک کی پہچان بھی، علم سے رغبت بھی، برائی سے نفرت بھی، توحید کی گواہی بھی۔ بندگی کی شان بھی، اِنسانیت کی معراج بھی، دھتکارے ہوؤں کی آبیاری بھی، یتیموں کی حوصلہ افزائی بھی، بیماروں کی تیمارداری بھی، غریبوں سے ہمدردی بھی، چھوٹوں سے پیار بھی، بڑوں کی عزت بھی، علم کی پیاس بھی، اللہ کی طلب بھی۔ سب کچھ کھو گیا ہے جناب۔ بزرگوں کی میراث سے لے کر اپنے وجود کی گواہی تک سب کچھ۔

برائے مہربانی، آپ کو خدا کا واسطہ، کچھ تو ڈھونڈ دیں یا طریقہ بتا دیں کہ کہاں جاؤں، کیسے حاصل کروں؟ میزبان کی آنکھوں میں ویرانی اور ہونٹوں پر خاموشی۔ عبداللہ کتنی دیر تک جواب کو ترستا رہا اور اعلانِ گمشدگی کا بورڈ اُٹھائے پورے میدان میں چکر لگاتا رہا۔

☆.....☆.....☆

ڈریکولا

ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے خود نہ لوٹے تو لوٹا دی جاتی ہے۔ عقلمندی یہی ہے کہ خود ہی لوٹ جائے۔ جو جو اپنی اصل پہ رہا اس نے ترقی و فلاح پائی۔ جو جو اس سے منحرف ہوا وہ خسارے میں رہا۔ ہر چیز کی ایک اصل ہوتی ہے۔ ایک بنیاد، ایک خمیر جو اِسے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مٹی کے خمیر والی اشیاء مٹی کی طرف لوٹتی ہیں، آگ والی آگ کی طرف۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ کسی شئے کی اصل کیا ہے؟

کچھوے کی اصل خول میں چلا جانا ہے۔ وہ جب رات پڑتی ہے، جب نیند کا غلبہ ہوتا ہے، جب خوف در آتا ہے، جب اپنے آپ سے بات کرنے کو جی چاہے، اپنا منہ خول کے اندر لے جا کر اپنے آپ کو دنیا سے کاٹ لیتا ہے۔

مچھلی کی اصل پانی ہے۔ گہرا پانی۔ وہ پانی کی اُپری سطح پر آ کر رزق تلاش کرتی ہے۔ بسا اوقات اِسی تلاش میں شِکاری کے ہاتھوں موت کے منہ میں پہنچ جاتی ہے۔ اور اگر نہیں تو کام پورا ہوتے ہی گہرے پانی میں جا کر جائے پناہ پاتی ہے۔

پرندوں کی پناہگاہ، ان کا خیمہ، ان کا گھونسلہ ہے اور اصل ہے اُڑان۔ اڑنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ وہ جب کچھ نہ بھی کر رہے ہوں تو بھی اڑتے ہیں، کوئی کام سے باہر جائیں، رزق تلاش کریں یا نیا مسکن، تو بھی اُڑ رہے ہوتے ہیں۔ آپ انہیں پنجروں میں قید کر دیں، سالہا سال تک، اغواء برائے تاوان کے قیدیوں کی طرح جرمانہ لے کر آزاد کریں مگر جیسے ہی دروازہ کھلا وہ اپنی اصل پر لوٹیں گے اور اُڑ جائیں گے۔

کائنات کی ہر شئے اپنی اصل، اپنے محور کے گرد گھوم رہی ہے۔ چلیں حقیقت چھوڑیں اور افسانوی کردار ہی لے لیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ڈریکولا اور ویمپائر کی اصل خون پینا ہے۔ جیسے ہی سورج غروب ہوا وہ اپنی جون، اپنی حالت پر پلٹتے ہیں اور لوگوں کا خون پینا شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ انسان کی اصل کیا ہے؟ اِس کا خمیر کہاں سے اُٹھا؟ اِس کی حقیقت کیسے بیان ہو؟

عبادت کا اصل معرفت ہے اور معرفت اللہ سے قرب کو کہتے ہیں۔ نیکی معرفت کی اِکائی ہے اور گناہ اِس کی نفی۔ انسان کی اصل بندگی ہے۔ اپنے رب سے قربت ہے مگر پتہ نہیں کیوں یہ نہیں لوٹتا اپنی جون کی طرف، اپنے خمیر کی طرف، یہ نہیں کہتا لبیک اپنی اصل کی آواز پر۔ ڈریکولا سے بھی گیا گزرا ہے۔ نہ دن میں اپنی اصل پر آتا ہے نہ رات میں، نہ صبح میں نہ شام میں، نہ جاگتے میں نہ سوتے، نہ غمی میں نہ خوشی میں۔ نہ مستی میں نہ ہستی میں۔ نہ کامیابی پہ نہ ہی ناکامی پہ۔ آخر ایک دن جانا ادھر ہی ہے۔

آپ کبھی کوئی پرانی کتاب پڑھیں، فلم دیکھیں یا کوئی ٹی وی ڈرامہ، تو ذرا دیر کو سوچیں کہ یہ ورلڈ وار کے ہیروز، یہ خوبصورت کردار، یہ دنیا کو پاؤں کی چوٹ پر رکھنے والے فنکار، یہ سب کہاں گئے؟ فرق صرف اِس بات کا ہے کہ کتنے اصل شکل وصورت میں گئے تو کتنے بہروپیئے ٹھہرے۔

اللہ کا ذکر وہ ریل گاڑی ہے جس کا آخری اسٹیشن اصل کے سِوا کچھ بھی نہیں۔

☆.....☆.....☆

قرآن

آج اتوار کا دن تھا۔ عبداللہ بھی باقی نوکری پیشہ لوگوں کی طرح گھر پر ہی تھا۔ اخبار کی سرخیوں سے فارغ ہو کر اس نے سوچا کہ چلو قرآنِ پاک کا مطالعہ کر لیا جائے۔ اس نے وضو کیا، سر پر ٹوپی رکھی اور قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔ چھٹی کی وجہ سے اس نے آج شلوار قمیض پہن رکھا تھا جسے وہ لباس کم اور سلیپنگ ڈریس زیادہ سمجھتا تھا۔

کوئی ایک آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ اس کی بیوی بھاگتی ہوئی آئی کہ اس کا بیٹا گلی میں سائیکل چلاتے گر گیا ہے اور گھٹنے پر شدید چوٹ آئی ہے۔ خون تو رک گیا ہے مگر ایکسرے کرانا ضروری ہوگا۔ عبداللہ نے بھاگم بھاگ گاڑی نکالی، بیوی اور بچے کو سوار کیا اور شہر کے سب سے مشہور اور مہنگے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ بیوی بچے کو استقبالیہ پر اُتار کر اس نے گاڑی پارک کی اور تیز تیز قدموں سے ہسپتال کے مین گیٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ شلوار قمیض پہنے ہوئے، پیر میں چپل، سر پہ ٹوپی۔ عبداللہ آج پہچانا ہی نہ جا رہا تھا کہ وہ شہر کا کوئی قابلِ ذکر آدمی بھی ہے۔ بے خیالی میں اس نے قرآنِ پاک بھی اُٹھا لیا کہ اندر ویٹنگ روم میں پڑھتا رہے گا۔

ابھی عبداللہ گیٹ سے داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

''اوے کدھر منہ اُٹھائے جا رہا ہے، دفع ہو یہاں سے''

عبداللہ نے آس پاس دیکھا، چھٹی کا دن کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ اِتنے میں پیچھے سے آواز لگاتے سیکورٹی گارڈ نے عبداللہ کو جا لیا۔

''کدھر مرتا ہے، گیٹ سے باہر جا''

گارڈ نے نخوست بھرے لہجے میں کہا۔

عبداللہ کو ایسے الفاظ سننے کی عادت نہ تھی۔ ابھی وہ کوئی جواب دینے کے لئے سوچ ہی رہا تھا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہ ہسپتال کے اندر سے ڈاکٹر ناصر ملک جو کہ ایک ماہر نیوروسرجن تھے آتے ہوئے دِکھائی دیئے۔ وہ عبداللہ کے پرانے واقف کار تھے۔ دور سے ہی پہچان گئے۔ انہوں نے آواز لگائی۔

ڈاکٹر عبداللہ، سونائس ٹو سی یو۔ پلیز کم، ہیو آ ٹی۔ سرجن صاحب کو دیکھتے ہی سیکورٹی گارڈ رفو چکر ہو گیا اور عبداللہ اندر چلا گیا۔ چائے پی کر عبداللہ نے بیٹے کی خیریت لی اور واپس گیٹ پر چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گارڈ نظر آ گیا۔ عبداللہ نے جا کر سلام کیا۔ اب گارڈ شرمندہ شرمندہ سا کھڑا تھا اور ایک ہاتھ سے سینے پر سجے نیم ٹیگ کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عبداللہ نے سچوئیشن کو بھانپتے ہوئے جیب سے سو کا نوٹ نکالا اور اُسے کہا۔ میں آپ کی شکایت کسی سے نہیں کروں گا۔ یہ روپے رکھ لو۔ صرف یہ بتاؤ کہ مجھے روکا کیوں تھا؟ میرے کپڑے بھی صاف ستھرے ہیں اور چال ڈھال بھی مناسب ہے۔

جی سر، بس معاف کر دیں۔ جانے دیں۔ غلطی ہو گئی۔

نہیں پلیز بتائیں۔ آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔

جی، دراصل وہ ایف ٹین کے باہر اور بھی کئی جگہوں پر جوان لڑکے ہاتھ میں قرآن لئے بھیک مانگتے ہیں۔ جلدی میں میری نظر آپ کے ہاتھ میں پکڑے قرآنِ پاک پر پڑی تو میں سمجھا آپ بھی بھکاری ہیں۔ لا اِلہ الاّ اللہ محمد رّسول اللہ کے نام پر بنائے جانے والے اِس دیس میں قرآن کی اِس تشریح پر عبداللہ کئی دن بول ہی نہ سکا۔

☆.....☆.....☆

بت شکن

آڑے ترچھے راستوں پر گاڑی پچھلے چار گھنٹوں سے چل رہی تھی۔ کولمبو سے سری لنکا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں خدا جانے کیا سوجھی کہ بدھ اِزم کے پیروں کاروں نے دنیا کا سب سے بڑا بدھا کا سٹنگ مجسمہ بنا ڈالا۔ خیر اللہ اللہ کر کے گاڑی آشرم میں آ کر رُکی۔ مونک یا بدھسٹ یوگی، جو کہ ملک کے مہایوگی بھی تھے، سے ملاقات طے تھی۔ ان کی ہمّت و استقامت کو خراجِ تحسین دینے کا دل کرتا تھا، جذبہ تو سچا تھا نا کہ اپنے خدا کو راضی کرنا ہے، بس کفر کے رنگ میں آیا تو فاسق ٹھہرا مگر بندے کے معبود سے تعلق کی بناء تو اصل ٹھہری۔

عبداللہ نے اپنا سوال پوچھا، آپ کو اس جنگل بیاباں میں پہاڑ کھود کر بُدھا کا پینسٹھ فٹ اونچا مجسمہ تراشنے کا خیال کیوں کر آیا؟

جی، ہوا کچھ یوں کہ بامیان میں طالبان نے بُدھا کا مجسمہ گرا دیا۔ تمام دنیا کے بدھ ازم پیروکاروں کو اس کا شدید دکھ ہوا۔ میں بھی ایک ادنیٰ سا یوگی تھا اِس چھوٹے سے گاؤں میں، ایک دن میری کٹھیا کے باہر شور اُٹھا، دیکھا تو مرد، عورتیں، بچّے ہاتھوں میں ڈنڈے اور پتھر لیئے کھڑے ہیں کہ آج جا کر بدلے میں کسی مسجد کو جلا دیتے ہیں، میں نے ان کو سمجھایا کہ یہ تو کوئی بدلہ نہ ہوا۔ اگر بدلہ ہی لینا ہے تو بُدھا کا اس سے بھی بڑا مجسمہ بناتے ہیں۔

لوگ میری عزت کرتے ہیں لہٰذا خاموش ہو کر چلے گئے۔ مگر میری روانی میں کہی گئی اپنی بات ہی مجھ سے چپک گئی۔ میں کئی دن تک سامنے موجود پہاڑ کو دیکھتا رہا اور پھر مصمّم ارادہ کر لیا کہ زندگی لگ جائے مگر دنیا کا سب سے بڑا بُدھا کا مجسمہ بنا کر ہی دم لوں گا۔

گاؤں والوں نے چندہ دیا۔ دوست احباب نے مدد کی۔ انڈیا سے مندروں کے بہترین آرکیٹیکٹ آئے۔ خود انڈیا کی سفیر چل کر آئیں عطیہ دینے۔ کوئی لگ بھگ تین کروڑ کی لاگت،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آٹھ سال کا عرصہ اور بامیان والوں کی چھاتی میں آگ لگا تا پینسٹھ فٹ کا بُدھا آپ کے پیشِ نظر ہے۔

بامیان میں تو طالبان کے ڈر سے کوئی جاتا نہ تھا، یہاں کوئی تین لاکھ زائرین سال کے آتے ہیں، ابھی سری لنکا کے صدر نے مجھے مہایوگی چُنا ہے اور یہاں کا وزٹ بھی کیا ہے۔ ہم اِسے ایک بُدھسٹ آشرم اور یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس کی تعمیر کے دوران اور بامیان کے بدلے کی آگ میں یہاں بی بی ایس کے نام سے بدھسٹ انتہا پسند جماعت بنی جس نے سری لنکا میں حلال گوشت بیچنے پر پابندی لگا دی، اسی جماعت کا ایک دھڑہ نائن ون سکس کے نام سے برما کے مسلمانوں پر عذاب بن کر ٹوٹا۔ انڈین گورنمنٹ اس مجسمے کی سپورٹ اور عطیات کی وجہ سے مقبول ہوئی اور آج اکیس سال بعد سری لنکا میں پاکستان مخالف حکومت آئی جو انڈیا کے زیرِ اثر ہے۔ سری لنکا سارک ممالک میں پاکستان کا واحد حلیف تھا وہ بھی گیا۔

آپ مسلمان ہیں، مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ نہ بامیان میں وہ ہوتا جو ہوا، نہ ہی ہمیں وہ رتبہ ملتا جو ملا۔

آپ کا شکریہ، آپ بہت اچھے بُت شکن ہیں۔

☆.....☆.....☆

بیوٹی فل لیگز

مئی جیونگ اور عبداللہ نے ورلڈ بینک میں ایک ساتھ سمر انٹرن شِپ کی تھی۔ واشنگٹن ڈی سی میں ساتھ کام کرنے کے وہ تین ماہ ایک مضبوط دوستی میں بدل گئے۔ عبداللہ اپنی پی ایچ ڈی کی تعلیم مکمل کر کے پاکستان چلا آیا تو مئی جیونگ نے مشہورِ زمانہ وال اِسٹریٹ جرنل میں صحافت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس کی فیلڈ اِنسانی نفسیات تھی اور لوگوں کو ان کی باڈی لینگویج سے جانچنا اس کی مہارت۔

آج کئی سالوں بعد عبداللہ کو فون کال ملی کہ وہ پاکستان آئی ہوئی ہے ایک اِسٹوری لکھنے کے لئے اور اس سے ملنا چاہتی ہے۔ عبداللہ نے خوشی خوشی اسے کھانے کی دعوت دی اور ملاقات طے پا گئی۔

عبداللہ نے مئی سے پوچھا وہ کون سی اسٹوری ہے کہ وہ نیویارک سے اِسلام آباد تک سفر کر کے آئی ہے۔

مئی نے جواب دیا، عبداللہ تمہیں تو پتہ ہے کہ میں خود لادین ہوں۔ ان مذاہب کے چکروں سے مجھے خوف آتا ہے، یہ سارے مجھے خدا تک پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ آج کل میں مسلمانوں، ان کے متشدّد نظریات، مرنے مارنے کی تاویلات اور ان کی طاقت کا اندازہ لگانے کی کھوج میں نکلی ہوئی ہوں۔ یہاں سے میں افغانستان بھی جاؤں گی۔

بہت خوب، میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟ عبداللہ نے سوال پوچھا۔

عبداللہ میں آج تک کسی مسجد میں نہیں گئی۔ مجھے بڑا شوق ہے کہ کسی مسجد میں جا کر دیکھوں کہ تم لوگ اپنے خُدا کی عبادت کیسے کرتے ہو۔ کیا تم مجھے کسی مسجد میں لے جا سکتے ہو؟

ٹھیک ہے۔ میں وزٹ کا بندوبست کر دوں گا مگر دو شرطیں ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایک تو یہ کہ جب رپورٹ چھپ جائے تو مجھے لنک ضرور بھیجنا۔

اور دوئم یہ کہ یہ جو تم نے منی اِسکرٹ پہنی ہوئی ہے، یہ مسجد میں جانے کے لئے موزوں نہیں ہے۔

عبداللہ اگلے دن مئی کو شہر کی مضافات میں بنی ایک شاندار مسجد میں لے گیا۔ مئی جیونگ، جیسا کہ عبداللہ کو ڈر تھا اپنے روایتی لباس میں تھی، منی اِسکرٹ تو اُس نے نہ پہنا مگر لباس بہت چست تھا اور نیکر بھی گھٹنوں سے اوپر تھا۔

عبداللہ نے سوچا کہ اب اگر ٹوکا تو شاید یہ مسجد جائے ہی نہ اور وہ کم از کم اِسکو اللہ سے دور کرنے کا الزام نہیں لے سکتا تھا۔

مسجد پہنچتے ہی عبداللہ نے وضو خانے کا رُخ کیا تو وہ بھی ساتھ ساتھ چلی آئی۔ دیکھا دیکھی اس نے بھی وضو کیا۔ عبداللہ کو تو کوئی فرق نہیں پڑا مگر وضو خانے میں موجود درجنوں افراد میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کی نظروں نے مئی کی گوری گوری ٹانگوں کا طواف نہ کیا ہو۔ اس کے جسم پر سرسراتا ہر قطرہ گویا آبِ زمزم بن کر داعیانِ حق کی پیاس بجھا رہا تھا۔

مغرب کی نماز کھڑی ہو چکی تھی مئی کو آخری صف میں کرسی پر بٹھا کر عبداللہ نماز میں شامل ہو گیا کہ نماز پڑھ کے اسے مسجد دکھا دے گا اور مولوی صاحب سے بات بھی کروا دے گا۔

جوں جوں نمازی آتے گئے مئی جیونگ کی ٹانگوں کا طواف ہوتا رہا۔ سلام پھیرتے ہی آدھی مسجد کی گردن اس کی طرف گھوم گئی اور چہ میگوئیوں سے خوب پتہ چلتا تھا کہ نماز میں بھی شاید اسی کا خیال ذہنوں پہ چھایا رہا۔

نماز کے بعد مئی نے فوراً واپس چلنے کو کہا۔ عبداللہ نے بھی خیر اِسی میں جانی اور واپسی کی راہ لی۔

عبداللہ تمہارا شکریہ، تم نے یہ نایاب موقع فراہم کیا۔ مجھے میرے سوالوں کے جواب مل گئے۔ مئی نے گاڑی سے منزل پر اُترتے ہوئے کہا۔

مگر کیسے؟ تم نے نہ تو مسجد پوری دیکھی، نہ کسی سے بات کی؟

عبداللہ، ضرورت ہی نہیں پڑی۔ مجھے پتہ لگ گیا کہ مسلمانوں کی جنونیت، شدّت پسندی، مذہبیت اور دشمنی کا حل کیا ہے۔ اور وہ ہے ہماری ثقافت۔

خُدا کے مذہب کے وہ دعویدار اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اُمتی جن سے میری ایک ننگی ٹانگ برداشت نہ ہو سکی وہ ہماری ثقافت کے آگے کھڑے ہی کتنی دیر رہ سکتے ہیں۔ جو تلاطم تمہاری صفوں میں میری ٹانگ نے برپا کیا ہے اس کے لئے فوج کی ضرورت ہی کیا ہے۔ عبداللہ یاد رکھنا جب ثقافت مذہب سے ٹکرائی، ثقافت جیت جائیگی اور مذہب ہار جائے گا۔ پھر ملیں گے۔ گڈ بائی۔

عبداللہ کو دو ماہ بعد رپورٹ کا لنک ای میل پر ملا۔

عنوان تھا

بیوٹی فل لیگز

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نیا راستہ

کامیابی اور اس کی مانگ ہمیشہ ایک جیسی ہوتی ہے، دنیا کا ہر شخص ''بڑا آدمی'' بننا چاہتا ہے اور کم وبیش ہر ایک کی بڑے آدمی کی تشریح پیسوں سے شروع ہو کر شہرت پر ختم ہو جاتی ہے۔ کچھ علم، ہنر، اَنا اور حسن کو بھی شمار کرتے ہیں تو کچھ تہذیب وتمدّن کا تڑکا لگانے کے لئے فنونِ لطیفہ اور ماحول سے محبت کو بھی شامل کر دیتے ہیں۔

مگر کامیابی کی تقسیم برابر نہیں ہوتی۔ ایک عجیب نہ سمجھ میں آنے والا سسٹم ہے۔ عجیب بانٹ ہے، کوئی الگ ہی حساب ہے۔ کون امیر، کون غریب۔ اللہ والے کبھی محتاج رہ جائیں تو مشرک و کافر ارب پتی ٹھہرے۔ عاجز ومجبور دنیا میں مشہور ہو جائیں تو سرمایہ دار وحکمران ذلیل ٹھہریں، بھوکوں کے دسترخوانوں سے زمانہ کھائے تو متمول ساہوکار ایسی بیماریوں میں گھر جائیں کہ زندگی پرہیز کرے۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کوئی نیا راستہ یا انوکھا طریقہ تو ایسا ہوگا کہ انسان کامیابی سے اِس سراب سے بچ کر اصل منزل کی طرف گامزن ہو سکے۔ وہ کیا بنیادی جزئیات ہوں کہ آدمی اِن سوچوں سے ماوراء ہو کے پرواز کر سکے۔ کون سے ایسے اخلاق ہوں جو اس کی ایسی وادیِ خاردار میں رہنمائی کریں، وہ کون سے اصول ہوں جو نفس کی اندھیری رات میں امید کی شمع جلائیں، اور وہ کون سا ایسا تعلق ہے جو مایوسی کی دلدل سے باہر نکالے۔

شاید آدمی کو کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہئے اور کتابوں سے محبت کرے اور حرام نہ کھائے۔ جھوٹ سے اتنی ہی نفرت کرے جتنی ہم سوئر سے کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں سچ بولنا اور کتاب پڑھنا بھی سوئر کھانے کی طرح حرام ہو چکے ہیں۔ یا شاید یہ کہ آدمی کسی کی بھی تحقیر نہ کرے۔ نہ باتوں سے، نہ اشاروں سے، نہ باڈی لینگویج سے، نہ گمان میں نہ خیال میں۔ یا شاید

یہ کہ کوئی بندہ اُس کی موجودگی میں خوف میں مبتلا نہ ہو کہ کب کیا ہو جائے یا یہ کہ ہمیشہ مسکرا کر بات کرے، اچھے اخلاق سے پیش آئے۔

جتنا میں اِس بارے میں سوچتا ہوں سوچ کے تانے بانے ایک لفظ پر آ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ جدھر سے چاہے شروع کروں اختتام اِسی لفظ پر ہوتا ہے۔ اور وہ لفظ ہے محبت۔

بندہ جب اللہ سے محبت کا اعتراف کر لیتا ہے اور اس پر کام کرنا شروع کر دیتا ہے تو وہ تمام جزئیات، اصول اور تکنیک اسے آتی چلی جاتی ہیں جو اس نئے راستے کا پتہ دیتی ہیں کہ جس میں فقر بھی غِنا ہے، جس میں محرومی بھی انعام ہے، جس میں دکھ بھی خوشی ہے، جس میں اس کا چاہے جانا، اس کی منشاء، اس کے کام، اس کی رضا سب کچھ ہے اور بندے کی گردن فرطِ جذبات سے خم ہے۔ ایسا بندہ اللہ سائیں کو کاپی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اللہ کی شان نہیں کہ وہ مخلوق کو رسوا کرے۔ یہ بندہ بھی کبھی کسی کو شرمندہ نہیں کرتا۔ اللہ سائیں کی شان نہیں کہ دروازہ بند کرے۔ اللہ کی شان نہیں کہ مانگنے والے کو خالی ہاتھ واپس کر دے۔ بندے اور اللہ کا موازنہ ہی کیا بس یہ اپنے تئیں جو بن پڑے وہ کرتا جاتا ہے۔

محبت ہی وہ راستہ ہے جو دنیا کے سراب سے پردہ اُٹھاتا ہے اور یہ ایک ایسی محبت ہے جس کی ہر صبح نئی ہوتی ہے۔ نئے رنگ، نئی خوشبو، نئی راہیں، نئی منزل۔ یہ وہ راستہ ہے جس کے قدم خود منزل چومتی ہے۔

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قاتِل

خوبصورت وادیوں ، پُرفضاء مقامات، بہتے جھرنوں اور فلک بوس پہاڑوں کے درمیان عبداللہ کی گاڑی تیز رفتار سے بڑھی جارہی تھی۔ دِل کی دھڑکوں کی رفتار شاید گاڑی کی رفتار سے زیادہ ہی تھی۔ عبداللہ آج بہت ایکسائیٹڈ تھا۔ اس کے ایک دوست نے اس کی ملاقات ایک شخص سے کروانے کا وعدہ کیا تھا اور وہ اسی شخص سے ملنے اس کے شہر جارہا تھا۔ شہر کیا، پہاڑوں کے بیچ و بیچ ایک برفانی گاؤں تھا جس کی آبادی کل آٹھ سو نفوس پر مشتمل تھی۔ اور عبداللہ کا میزبان اس شہر کا بلاشرکت غیرے مطلق العنان مالک تھا۔

عبداللہ کو ایسے لوگوں سے ملنے کا بڑا شوق تھا جنہوں نے اپنی زندگی کسی ایک مقصد کے لئے گزار دی۔ صحیح یا غلط اس بات سے بحث نہیں۔ بس مقصد اتنا بڑا تھا کہ وہ زندگی کو کھا گیا اور بندہ اتنا پختہ مزاج اور صابر کہ جُتا رہا زندگی بھر اس کام میں۔

عبداللہ نے انگوروں کی بیلوں کے درمیان گاڑی روکی، یہ پوری وادی خالص شراب بنانے کے لئے صوبے بھر میں مشہور تھی۔ سامنے لان میں اس کی نظر ایک بیاسی سالہ بوڑھے پر پڑی جس کی گہری اداس آنکھیں کسی تلاش کا مژدہ سنا رہی تھیں جو اُسے شاید نہ مل سکی۔ چوڑی پیشانی ذہانت کا اظہار کر رہی تھی۔ بھرا ہوا کسرتی جسم اس بات کا صادق تھا کہ جوانی کس جوش و ولولے میں گزری ہوگی، بھرے ہوئے ہاتھ اچھی خوراک کا پتہ دیتے تھے۔ مہنگی پوشاک امارت کی چغلی کھا رہی تھی، نشست کے پیچھے کھڑے چاق و چوبند باڈی گارڈز اُس کی زندگی کی اہمیت کا تخمینہ لگانے کے لئے کافی تھے، تو بازو میں کھڑی خوبصورت حسینائیں رنگین مزاجی کا ثبوت تھیں۔

یہ شخص رابرٹ اتارینو تھا، امریکہ میں اطالوی مافیا کا بے تاج بادشاہ۔ اس کے ذمے بالواسطہ یا بلاواسطہ چھ سو افراد کا قتل تھا۔ پہلا قتل اس نے صرف گیارہ سال کی عمر میں کیا جب اس نے اپنے

سے دگنی عمر کے آدمی کی گردن اپنے ہاتھوں سے مسل دی۔

عبداللہ نے اس کے جذبے اور لگن کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مصافحہ کو ہاتھ بڑھائے، کام کتنا برا ہی کیوں نہ ہو، اس کے پیچھے کارفرما لگن اور جذبہ تو سچا ہی ہوتا ہے۔ اس دنیا میں جہاں کتے بلیوں کے حقوق کا رونا روتے عمر گزر جایا کرتی ہے وہاں چھ سو افراد کو ذبح کر کے آزاد گھومنے پھرنے والے نے کچھ تو ایسا کیا ہوگا جو عام فہم و اِدراک سے باہر ہے۔

رابرٹ کے لہجے میں بے نیازی کی کاٹ تھی اور الفاظ اتنے نپے تُلے کہ جیسے کچہری میں جج کے سامنے کٹہرے میں کھڑا ہو۔ عبداللہ نے وقت کی مناسبت سے خلوت میں آدھ گھنٹہ مانگا جو اسے مل گیا۔

عبداللہ نے سوالات کی ابتداء کی۔

کیا آپ خُدا پر یقین رکھتے ہیں؟

میں بڑا منافق ہوں اگر میں کہوں کہ ہاں یقین رکھتا ہوں، کیونکہ میری پوری زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ میں خدا کو نہیں مانتا، اگر مانتا تو کیا وہ کرتا جو میں نے کیا۔

چلیں مجھے اس طرح کہہ لینے دیں کہ ہاں میں خدا پر یقین رکھتا ہوں مگر اس کے طریقوں پر نہیں۔ اس لئے بزنس اور دنیا چلانے کے معاملات میں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

کوئی شرمندگی، کوئی پچھتاوا، اگر موقع ملے تو کوئی زندگی کا ایسا موڑ یا فیصلہ جو آپ بدلنا چاہیں؟

کچھ نہیں۔ میں بالکل مطمئن ہوں۔ کوئی شرمندگی، کوئی پچھتاوا، کوئی خوف نہیں، کچھ نہیں بدلنا، میں ہمیشہ سے سچا قاتل رہا۔ سچائی کا قاتل نہیں۔ لوگ بے وقوف ہیں، ہم جیسوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں اور ان کو نہیں جو سرِعام سچ کو قتل کر دیتے ہیں حالانکہ وہ اِس سے کہیں بُرا فعل ہے۔

کس چیز سے ڈرتے ہیں؟

کسی سے نہیں، جو آدمی اپنے آپ سے نہ ڈرے وہ بے خوف ہو جاتا ہے۔ آپ کا نفس، آپ کا ضمیر ہر وقت آپ کو اندیشوں اور خوف میں گھیرے رکھتا ہے۔ اپنی جان کی حفاظت کا راگ الاپتا ہے۔ آدمی ایک بار اپنے آپ سے جنگ جیت لے تو دنیا سے ہار نہیں سکتا۔

میں اپنے کیریئر کے مِڈ پوائنٹ پر ہوں، بہت پلاننگ کرتا ہوں آگے کی۔ کیا مشورہ دیں گے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پلاننگ اچھی چیز ہے، ضرور کرنی چاہئے۔ یہ آدمی کو فوکس کرنا سکھاتی ہے اور ایک اچھا مقلد (Follower) بناتی ہے۔ آدمی دنیا تیاگ کر لکھی ہوئی چند لائنوں کے پیچھے زندگی گزار دیتا ہے۔ لکھے ہوئے پر چلنے والے اب نایاب ہوتے جا رہے ہیں مگر ایک بات یاد رکھنی چاہئے کہ خُدا کا بھی ایک اسکرپٹ ہوتا ہے اور جب اُس کا لکھا ہوا آپ کے لکھے سے متصادم ہو جائے تو اس کا لکھا چلتا ہے، جب حالات سازگار نہ رہیں، جب سب کچھ آپ کے لکھے سے اُلٹ ہو تو سمجھ جائیں کاپی بدل گئی ہے۔ ایسے میں فلوٹ کریں، اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔ انجوائے کریں اور اس کے لکھے پر راضی ہو کر اپنے کردار کو جانفشانی سے نبھائیں۔ اِس یقین کے ساتھ کہ اس کا اسکرپٹ آپ کے اسکرپٹ سے اچھا ہے۔ یہ کہتے ہوئے نجانے کیوں رابرٹ کی آنکھیں بھر آئیں اور مضبوط پختہ ہاتھوں پر رعشہ آ گیا۔

زندگی کا سب سے بڑا سبق؟

سب سے بڑا سبق جو میں نے سیکھا وہ یہ ہے کہ ہر آدمی کا اپنا ایک اینگل ہوتا ہے سوچنے اور سمجھنے کا نظریہ۔ آپ کو پہلے وہ معلوم کرنا چاہئے۔ اس کے بعد آپ اس کی کہی ہوئی باتوں اور کیئے گئے اعمال کو ٹھیک سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور اس کے شر سے بچ سکتے ہیں۔

کیسے مافیا کی دنیا میں آئے اور کیونکر اِس سے باہر نکل سکے؟

ایک ہی وجہ تھی، محبت۔ پیسے کی محبت اِس فیلڈ میں لے کر آئی مگر جب یہاں کے خُداؤں نے میری بیوی کی موت کے پروانے پر دستخط کر دیئے تو اس کی محبت میں، میں سب سے ٹکرا گیا۔ مافیا دنیا کی سب سے زیادہ ایماندار اور کرپشن سے پاک آرگنائزیشن ہوتی ہے۔ بیوی بچوں کو ہم کچھ نہیں کہتے۔ جب اِس کے کرتا دھرتاؤں نے اپنے ہی اصول توڑ دیئے تو میں اکیلا سب سے ٹکرا گیا اور سب کو لے ڈوبا۔ محبت جیت گئی، دنیا ہار گئی۔

آخری سوال۔ اللہ کا سامنا ہوا تو کیا کہیں گے؟

تیری دنیا کو بُرے لوگوں سے پاک کرنے کا دھندہ کرتا رہا اور خوب کامیابی سے کیا۔

اگر میرا پلان تیرے پلان کے مطابق رہا تو انعام واکرام کر۔

اگر وہ اِس سے متصادم رہا تو بخش دے۔ تُو جانتا ہے کہ میں نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا۔

جب کبھی قانون اور سچ مدمقابل ہوئے تو میں سچ کی طرف تھا، بجائے اِس کے کہ میں لوگوں کا ساتھ دیتا اور تو مجھے پرکھتا، میں نے سچائی کا ساتھ دیا۔ دل کی گواہی مانی اور چھوڑ دیا دنیا پر کہ جیسے

چاہے پرکھے۔ تو مالک ہے، تیری قدرت ہے، تیرے کام ہیں۔ جہاں جہاں حدود سے تجاوز کی وہاں اپنی رحمت سے حدود کی باؤنڈریز تبدیل کر دے۔ تو بخش دے تو کون پوچھے گا۔

یہ کہہ کر رابرٹ نے ہنستے ہوئے سگار کا کش لگایا اور عبداللہ کو اس کی روتی آنکھوں کے ساتھ چھوڑ کر اپنے گم نام مسکن کی طرف چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جیت

منوچر جاویدی سے عبداللہ کی نئی نئی دوستی ہوئی تھی۔ عبداللہ کو اُس میں ہمیشہ ایک گھاک بزنس مین نظر آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جس کاروبار میں ہاتھ ڈالتا ہے مٹی سونا بن جاتی ہے۔ عبداللہ حیران ہوتا کہ خدا کچھ لوگوں پر دنیا کس قدر کھول دیتا ہے۔ انہیں کوئی غم نہیں ہوتا۔ کامیابیاں ہر وقت قدم چومتی ہیں۔ جو چاہے کریں، جیسا چاہے کریں مگر شاید یہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ جس زندگی میں کوئی غم نہ ہو کیا وہ بھی کوئی زندگی ہے؟

یہ غم بندے کو اللہ سے ملا دیتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو بندہ سمجھتا ہے کہ اسے اللہ کی ضرورت کوئی نہیں ہے۔ بیوقوف اور بدعقل ہی ایسا سوچ سکتا ہے۔ عقلمند آدمی کو تو اللہ کی ضرووت ہمیشہ ہی رہتی ہے۔ پیدائش سے پہلے بھی، زندگی بھر اور مرنے کے بعد بھی۔ عبداللہ کو ہنستی مسکراتی ولولہ انگیز آنکھوں میں خُدا کم کم ہی نظر آیا تھا۔ اُسے ہمیشہ سے روتی، آنسو بہاتی، سوال پوچھتی آنکھیں پسند تھیں۔

عبداللہ نے سوچا کوئی تو ایسا ہنر، ایسا ٹوٹکا ہوگا اِس شخص کے پاس کہ چلو دنیا ہی سہی، حاصل تو ہوئی۔

عبداللہ نے آج ملاقات پر پوچھ ہی لیا۔

منوچر، کاروبار کی کامیابی کا راز کیا ہے؟

عبداللہ جب میں لڑکپن میں تھا تو میرے والد صاحب نے مجھے کاروبار کرنے کا کہا اور بتایا کہ 3 چیزوں کا خیال رکھو، کبھی ناکام نہیں ہوگے۔

1) ہمیشہ کمپنی میں ایک بہترین وکیل کی خدمات حاصل کرو۔

2) ایک بہترین اکاونٹنگ فرم کی خدمات حاصل کرو۔

ان دو کاموں کو کرنے سے کسی بھی قسم کی مالی بے ضابطگی کا خدشہ ختم ہو جاتا ہے اور قانونی پیچیدگیوں سے بھی چھٹکارا مل جاتا ہے۔ مزید دنیا میں کام کرنے کے لئے دنیاوی اصول وضوابط کا پتہ رہنا چاہیئے۔ اور تیسرا کام جو سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ

3) ترقی کی اِنتہا آسمانوں کی بلندی ہے جس کی حدود کوئی نہیں مگر اِن بلندیوں پر چڑھنے کا زینہ برداشت اور صبر ہے۔

یاد رکھنا، اگر یہ آخری مرحلہ چُھٹ جائے تو باقی دونوں بھی کام کے نہیں رہیں گے۔

عبداللہ نے دوسرا سوال پوچھا۔ اچھا یہ بتایئے آپ نے اِن 60 سالوں کی عمر میں چوتھا کون سا اُصول سیکھا؟

منوچر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

Negotiation

دنیا کی ہر چیز نیگوسیاشن ہے۔ محبت سے لے کر رشتوں تک، سواری سے لے کر گھر، اور کاروبار سے لے کر مالی لین دین تک۔ آپ ایک بار نیگوسیاشن سیکھ جائیں۔ کیسے مدِّ مقابل کو غصّہ دِلانا ہے، فرسٹریٹ کرنا ہے، کیسے اس پر حاوی ہو کر اپنی بات منوانی ہے، ڈنڈے اور گاجر کا کھیل کیسے کھیلنا ہے تو دنیا آپکی ہوئی۔

اچھا، پھر تو آپ کے بہت سے دشمن بن گئے ہوں گے؟ عبداللہ نے پہلو بدلا۔

نہیں عبداللہ، دشمن بنانے کے لئے لڑنا ضروری تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ بس آپ تھوڑے سے کامیاب ہو جائیں وہ آپ کو خیرات میں خود بخود مل جاتے ہیں۔

عبداللہ نے دل میں سوچا کہ اگر قدرت نے اچھا بولنے، لوگوں کے جذبات سے کھیلنے، ان پر حاوی ہونے کا منکہ دے ہی دیا ہے تو اِس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ اپنی عقل کے بل بُوتے پو سب سے فائدہ اُٹھانا شروع کر دیں۔ آدمی کو اپنی عقل، زبان، رُتبے اور تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو لاوارث نہیں سمجھنا چاہیئے۔ لاوارث تو وہ ہوتا ہے جس کا کوئی ربّ نہ ہو۔ اور اللہ سے تو کوئی نیگوسیاشن ہوتی ہی نہیں ہے۔ بندہ اللہ سے بھاؤ تاؤ نہیں کرتا، یہ اِس نسبت کو زیب نہیں دیتا۔

نہیں منوچر، کوئی اور بات ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جس سے آپ کو لگتا ہے کہ آپ کو ترقی و کامیابی نصیب ہوئی ہے مگر اصل بات کوئی اور ہے۔ ذہن پر زور دیں کوئی ایسا واقعہ جو آپ کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ذہن میں نقش رہ گیا ہو۔کوئی ایسی بات جو بزنس ڈِیل کرتے ہوئے آپ کو بار بار یاد آتی ہو؟

منو چر کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

ہاں عبداللہ، ایک واقعہ تو ہے۔

مجھے بچپن میں کراٹے سیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ بلیک بیلٹ کے حصول کے لئے فائنل مقابلے کیلئے ساؤتھ کوریا گیا۔ فائٹنگ رِنگ میں مدّ مقابل کو ناک آؤٹ کرنا جیت کا ضامن تھا۔ رِنگ میں جانے سے پہلے میرے اُستاد نے کہا، آخری پنچ مار دینے والا فاتح کہلاتا ہے، مگر یہ جانتے ہوئے کہ یہ آخری مُکا حریف کو شکست کے پار چھوڑ دے گا۔ پھر بھی آدمی رک جائے اور واپس آ جائے اِس یقین کے ساتھ کہ میں جب چاہوں جیت سکتا ہوں۔ یہ یقین، یہ کانفیڈنس آدمی کو مقدر کا سکندر بنا دیتا ہے۔

کسی شئے کے اِسپیشل ہونے کے لئے صرف اتنا ضروری ہے کہ اُسے اسپیشل سمجھا جائے۔

پھر عبداللہ یہی ہوا کہ میں نے آخری مُکا نہیں مارا۔ جیت میری ہی ہوئی۔ اور آج تک میں ہر ڈیل میں اِس یقین کے ساتھ جاتا ہوں کہ میں فاتح ہوں۔

کسی چیز سے رک جانے کی قوت، کسی چیز کو کر بیٹھنے کی قوت سے 1000 گنا زیادہ ہے۔ میں نے جیت کو اِس قوت کے ساتھ نتھی کر دیا ہے۔

عبداللہ نے روتی آنکھوں کے ساتھ منو چر کا شکریہ ادا کیا۔ اُسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

رات جانماز پر وہ اپنے ربّ سے رک جانے کی قوت مانگ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

بیلنس لائف

بیلنس لائف، یعنی کہ زندگی میں وقت کو صحیح طرح سے تقسیم کر کے گزارنا ایک مفید اور قابلِ عمل ضابطہ حیات ہے۔ آپ آفس کے وقت پر کام کریں، نماز کے وقت نماز پڑھیں، شام کو گھر پر بیوی بچوں کو وقت دیں، کچھ وقت عزیز رشتہ داروں کے لئے، کچھ پڑھنے پڑھانے کے لئے، کچھ دین سیکھنے کے لئے، کچھ اللہ کے ذکر کے لئے اور کچھ اپنے کسی آئیڈیے یا وژن کے لئے جسے آپ مستقبل میں پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔ اگر اس طرح سے وقت تقسیم ہو سکے (اور اس کی بھرپور کوشش بھی کرنی چاہئے) تو کیا کہنے۔

مگر ہمارے معاشرے میں یہ بہت مشکل کام ہے۔ اور ایسا نہ ہونے کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ پہلی تو یہ کہ معاشرے میں زندہ رہنے کی بنیادی شرائط مفقود ہیں۔ جس معاشرے میں سکون ہو نہ انصاف، بجلی ہو نہ پانی، سچائی ہو نہ دیانتداری وہاں آئیڈیلز کے ساتھ جینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ آدمی بیلنس لائف کا تو وہاں سوچے جہاں ہر شخص اپنے حصے کا کام کر رہا ہوں۔ جہاں ایک ایک آدمی کو پورے پورے اداروں کا کام کرنا پڑے، پوری نسل کی آبیاری کرنی پڑے وہاں بیلنس لائف کا رونا رونا نہیں چاہئے۔ یہ راگ ٹریننگ ورکشاپس میں الاپنے تک تو ٹھیک ہیں مگر جو تھوڑے بہت لوگ کام کر رہے ہیں انہیں بیلنس لائف کے جال میں نہیں پھنسانا چاہئے۔ پِتّہ ماری کی محنت کرنی ہی پڑتی ہے۔ مہنگے خواب دیکھنے کے لئے آنکھیں بیچنی ہی پڑتی ہیں۔ جب تک رات کے اندھیروں کو دن کے اجالوں میں بدلنے کا فن نہ آئے۔ نصیب کی تاریکیاں دور نہیں ہوتیں۔

اگر آپ کسی بڑے منصوبے یا پلان پر کام کر رہے ہیں تو اس پر زندگی تباہ کرنی ہی پڑتی ہے، تب کہیں جا کے اُمید کی کوئی کِرن پھوٹتی ہے۔ چپ چاپ سر جُھکا کے کام کرتے رہیں۔ اور بیلنس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لائف ان کے لئے چھوڑ دیں جنہیں نہ تو بیلنس کا مطلب آتا ہے نہ لائف کا۔

دوسری وجہ بیلنس لائف پر عملدرآمد نہ ہو سکنے کی ہر فیلڈ، ہر شئے میں تکمیل (پرفیکشن) کا جنون ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا بچہ امتحانوں میں بھی سرفہرست رہے۔ بیت بازی میں بھی اس کا کوئی ثانی نہ ہو، کرکٹ ایسی کھیلے کہ لوگ دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔ زبان یوں بولے کہ لکھنؤ کی یاد تازہ ہو جائے اور دین پر ایسی گرفت کہ امام غزالیؒ کا گمان ہو۔ ہمارا بس چلتا تو بچہ فیکٹری سے آرڈر پر بنوا لیتے (ویسے یہ دن بھی دور نہیں ہے) اور اِس پہ فتنہ یہ کہ اب اِسی بچے کو تلوار بنا کر پڑوسیوں، رشتہ داروں اور ملک کے باسیوں کی گردنیں اتارنے لگتے ہیں۔ کیا ہی کم ظرفی ہے کہ اُس چیز پر اِتراتے ہیں جو سرتاپا خُدا کی دین ہے اور اپنا کوئی کمال ہی نہیں ہے۔

دو سو سال سے برصغیر پاک و ہند میں اُمت اِس انتظار میں ہے کہ ایسا عالم آئے جو فزکس کا بھی بادشاہ ہو، وہ شیخ الحدیث آئیں جو پائلٹ بھی ہوں، ایسا اِمام مسجد ہو جو بہترین بزنس مین بھی ہو وغیرہ وغیرہ۔ اِسی دھما چوکڑی اور ذہن کے فتور میں نہ تو ہم بزنس مین اور پائلٹ بنا سکے اور نہ ہی شیخ الحدیث۔ جو شخص بخاری پڑھا لے وہ شیخ الحدیث اور جس نے نکڑ کی دکان کھول لی وہ بزنس مین۔ مغرب کے پاس پیسہ ہے دین نہیں۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔ ایسا نہیں ہوتا، خُدارا کوئی ایک فیلڈ کا اِنتخاب کریں اور زندگی لگا دیں۔ بعد میں آنے والے لوگ آپ کی بیلنس لائف کے گیت خود ہی گاتے رہیں گے۔

دنیا ہمت کی مرہون منّت ہے، حوصلہ کریں، ہمت باندھیں اور جو چاہیں وہ کر گزریں کون روکتا ہے۔ ہر شخص کا بیلنس (اعتدال) اپنا ہے۔ اونٹ کی ٹانگ کا بیلنس کچھ اور تو چوہے کی ٹانگ کا کچھ اور۔ درجن کا آدھا چھ تو عشرے کا آدھا پانچ۔ ایک ہی معیار پہ سب کو جانچنے کا طریقہ کیا ہو؟

یہ لوگ اِمام غزالیؒ کے پاس کیوں نہیں گئے بیلنس لائف کا رونا روتے ہوئے جب وہ 12 سال کے لئے قاضی القضات (چیف جسٹس) کا عہدہ چھوڑ کر تصوّف کی راہ پر چل پڑے۔ اور اِمام ابوحنیفہؒ سے کیوں نہیں کہا کہ حضرت رات کو سو جایا کریں، بیلنس لائف اور پوری نیند بڑی چیز ہے۔ فقہ کا کام کوئی اور کر لے گا۔ قائداعظمؒ کو کیوں نہیں ٹوکا کہ آپ تن تنہا کیا کروڑوں مسلمانوں کے ذمہ دار ہیں؟ علامہ اقبالؒ سے کیوں گلہ نہیں کیا کہ کیا اُردو فارسی میں آپ کے بعد کوئی شاعر نہ آئے گا؟ مدر ٹریسا کو کیوں نہ بولا کہ کیوں زندگی جھگیوں میں بسر کرتی ہو، نیلسن منڈیلا سے کیوں نہ

عرض کی کہ حضرت 27 سال سے جیل میں ہیں، چھوڑیں ضد کو اور بیلنس لائف گزاریں، اِسٹیو جابز کی مثال لائیں۔ بِل گیٹس کو دیکھیں۔ ہر وہ شخص جس نے کوئی بڑا کام کیا، مادام کیوری سے لے کر عبدالستار ایدھی تک، ان کی زندگیوں میں بیلنس لائف نہیں، جنون نظر آتا ہے۔

اب ایسے لوگوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا اور میرے جیسے نالائقوں کو چند کتابیں پڑھنے اور چند لائنیں لکھنے پر لوگ بیلنس لائف، بیوی بچوں سے محبت اور گھر گرہستی کا طعنہ دینے آ جاتے ہیں۔ آیئے ایسی لائف گزارتے ہیں کہ یہ پروفیشنل ٹریزز اپنی ورکشاپس میں مثال کے طور پر پیش کر سکیں۔

آمین

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اعتماد

تمثیل چوہدری کا نام پورے ملک میں پروفیشنل ٹرینرز میں سرِفہرست تھا، کوئی یونیورسٹی یا کالج شاید ہی بچا ہو ملک بھر میں جہاں اس کے سیمینار اور ورکشاپ منعقد نہ ہوئے ہوں۔ خود اعتمادی اور پرسنل کانفیڈنس پر جو منکہ انہیں حاصل تھا باقی ٹرینرز اِس کی گرد کو بھی نہ پہنچتے تھے۔

ایسا لگتا تھا کہ وہ پڑھاتے وقت ورکشاپ کے طالب علموں کی زندگیوں سے، اُن کے دلوں میں چھپے جذبات سے اور ذہنوں میں گردش کرتے سوالات وشبہات سے باخوبی واقف ہیں۔

عبداللہ نے آج ان کا انٹرویو کرنے کا فیصلہ کیا جو سب کو اِنٹرویو دینے کے گُر بتاتی ہیں۔

تمثیل آپ کا بہت شکریہ، مجھے معلوم ہے کہ آپ کتنی مصروف ہیں اور آپ کی مارکیٹ میں کیا مانگ ہے۔ آپ نے میرے چند سوالوں کا جواب دینے کی حامی بھری، آپ کی مہربانی۔

ڈاکٹر عبداللہ، میں لوگوں کو اِنٹرویو دینا سکھاتی ہوں مگر خود کبھی نہیں دیتی، آپ میری ورکشاپ میں آئے، جو درد اور تڑپ آپ کی آنکھوں اور لہجے میں تھی وہ تجاہل سے ماوراء تھی۔ کوئی تو ایسی بات تھی کہ جب آپ نے انٹرویو کرنے کی فرمائش کی تو میں منع نہ کر پائی۔ خیر چھوڑیں، وقت شروع ہوا، آپ پوچھیں۔

آپ اپنے طالب علموں سے کیسے اس لیول پر کنیکٹ کر پاتی ہیں جس پر کوئی دوسرا نہیں پہنچ پاتا۔ جو فائدہ لوگوں کو آپ کی ورکشاپ سے ہوتا ہے وہ کہیں اور سے نہیں ہوتا۔ کیا وجہ ہے؟

عبداللہ بہت سادی سی وجہ ہے اور وہ ہے حقیقت۔ باقی ٹرینرز چند یوٹیوب ویڈیوز دیکھ کر، چند مشہور موٹی ویشنل اِسپیکرز کی ماورائی کتابیں پڑھ کر، اِسٹیون کوی، رابن شرما اور دیپک چوپڑا کے محاورے یاد کر کے سمجھتے ہیں کہ wow فیکٹر پیدا کر لینے سے مسائل حل ہو جاتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ wow فیکٹر، کچھ قہقہے، بہت سی تالیاں اور ایک آدھ بار اِسٹینڈنگ اوویشن تو دلا سکتا ہے مگر

لوگوں کی زندگیوں پر، اُن کے عمل پر کوئی دائمی اثر نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے، اِن حقیقتوں سے گزری ہوں، اِسی معاشرے میں پل کر جوان ہوئی ہوں۔ میں حقیقت اور ڈرامے میں فرق کر سکتی ہوں اور یہی وہ وجہ ہے کہ میں اپنے کلائنٹس کے مسائل سمجھ سکتی ہوں۔

اعتماد کی ٹھیس کسے کہتے ہیں؟

اعتماد کی ٹھیس اُمید کی موت ہوتی ہے۔ یقین کا اُٹھ جانا ہے۔ مایوسی کی نوید ہے۔ جب بندہ اپنے آپ سے مایوس ہو جائے، اپنے آپ سے ہار جائے تو وہ دنیا سے نہیں جیت سکتا۔ اعتماد کے ٹوٹنے کی اذیت، جنسی زیادتی جتنی ہوتی ہے کہ آپ کی مرضی ومنشا کے بغیر، آپ کو بے دست و پا کر کے، مجبور و مظلوم جسم پر کوئی آری سی چلتی ہے، ظالم کو مزہ آتا ہے، مگر مظلوم کو ہر وار پہ جسم کٹتا، گلتا اور سڑتا محسوس ہوتا ہے اور سرانڈ کی یہ بُو رہتی زندگی نہیں جاتی۔ ہر رات، ہر خواب، ہر دستک، ہر چوٹ، ہر جسم، کُل کائنات آپ کو ریپسٹ لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سب نے مل کے آپ کی عزت لوٹی ہے سب نے مل کے آپ کو مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔ میں دونوں اذیتوں کو سمجھتی ہوں کہ دونوں سے گزری ہوں۔ جب بچے میرے پاس آ کر روتے ہیں کہ فلاں شخص نے میری عزت خراب کر دی تو میں ہنس پڑتی ہوں کہ نہ بابا، تمہیں تو پتہ ہی نہیں ہے کہ عزت خراب ہونا کسے کہتے ہیں۔

عبداللہ لوگوں کو سمجھنے کے لئے wow نہیں ouch فیکٹر درکار ہوتا ہے۔ میں لوگوں کو بتاتی ہوں کہ ذلت کسے کہتے ہیں اور انہیں اپنی عزت کا اندازہ ہو جاتا ہے بس اتنی سی بات ہے۔ یہ بہت ذاتی بات ہے، آپ کسی کو بتانا نہیں۔ اور کوئی سوال۔

عبداللہ کی آنکھ کے آنسو اس کے سارے سوال دھو چکے تھے۔

اُس نے بمشکل تمام کہا، جیتی رہیں۔

تمثیل نے اِسٹیج سنبھالا اور حاظرین سے مخاطب ہوئی،

آیئے، اِس دنیا سے اپنا اعتماد واپس لیتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گلی کے بچے

گلی کے بچے (اِسٹریٹ چلڈرن) دنیا بھر اور اقوامِ متحدہ کی توجہ کا خصوصی مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ہر کوئی ان کے حقوق کی آواز اُٹھا رہا ہے۔ ہر کوئی کسی ننگے بھوکے غمزدہ بچے کی کچرے کے ڈھیر پر، مکھیوں کے جمگھٹے میں، بوسیدہ کھانے پر لیٹے ہوئے تصویریں لئے دنیا بھر کے ضمیر کو چیلنج کر رہا ہے کہ کوئی تو بھیک دے، کوئی تو مدد کرے، کوئی تو سہارا بنے۔

ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر میں کوئی 100 ملین (دس کروڑ) اِسٹریٹ چلڈرن ہیں۔ صرف پاکستان میں کوئی 15 لاکھ بچوں کا شجرۂ نصب کسی گلی کے نکڑ پر پہنچ کر رک جاتا ہے اور سالانہ 17 ہزار بچوں کا اس میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

عبداللہ سوچا کرتا کہ یہ سترہ ہزار بچے کہاں سے آئے؟ اِسی اسلامی جمہوریہ پاکستان کی پیداوار ہے نا، یا یہ بھی کوئی امریکی یا اسرائیلی سازش ہے۔ یا یہ کہ ان کے حقوق دلانے کے لئے بھی کسی خلافت یا امیر المومنین کی ضرورت ہے۔

سارہ کا شمار، پتھر دلوں کے اِس معاشرے کے چند ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جو کانچ کا دل لئے، شیشے کے گھر میں رہتے ہیں۔ اِن کے نازک جذبات اور لطیف احساسات نہ اِنہیں رات کو سونے دیتے ہیں نہ دن کو جینے دیتے ہیں۔ یہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر، ساری مصلحتیں بھُلا کر، اِن بچوں کی آبیاری میں لگ جاتے ہیں جن کو اِن کے اپنے وارثوں نے لاوارث کر دیا۔

سارہ ان بچوں میں باجی کے نام سے مشہور تھی۔ وہ باجی جو ان کے ساتھ ان میں گھل مل جاتیں۔ کھانا پینا اور کپڑے تو کبھی کبھار کوئی بھی دے جاتا، مگر یہ باجی اُن کا بچپن لوٹاتی تھیں۔

سارہ کی آرگنائزیشن کا مقصد بچوں کو ان کا چھینا ہوا بچپن لوٹانا تھا۔

ایسے لوگوں کے دل کیونکہ شیشے کے ہوتے ہیں لہٰذا ہر شخص کو اس میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ بیمار معاشرے کے مریض لوگ، جب انہیں دیکھتے ہیں، کوئی برائی ہی نظر آتی ہے۔ بے وقوف اتنا بھی نہیں جانتے کہ کچھ لوگوں کی روحیں ان کی سوچ اُن کے جسموں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اُن کی اپنی ہستی، اُن کے وژن میں گم ہو جاتی ہے۔ مگر جذبات وشبہات سے ماوراء ہو کر سوچے ہی کون۔ ہمارے معاشرے میں خوبصورتی وہ گالی ہے جو جب چاہیں جس کے منہ پر کالک بنا کر مل دیں، اب بے چارہ مظلوم خود ہی دلائل دیتا پھرے۔

ایسے میں تمام دنیا کو قتل کر کے ایک بار ہی دل کے قبرستان میں دفن کر دینا چاہئے۔ اور پھر فاتحہ پڑھ لیں کہ آج کے بعد نہ کسی کی تعریف سے فرق پڑے نہ بُرائی سے۔

آج صبح آرگنائزیشن کی بس نے گلی نمبر 5 سے کچھ بچوں کو اُٹھایا تو دوسری جھگیوں کی کسی گلی سے کچھ اور کو۔ جب وہ آرگنائزیشن کے دفتر پہنچی تو لوگوں اور پڑوسیوں نے بس کو دیکھ کر یوں منہ بنایا کہ جیسے کچرے کی ڈالی کچرہ سمیٹ رہی ہو۔

ہال میں 20 کے قریب بچے اور بچیاں کھڑے تھے۔ پاکستان کے ترانے سے دن کا آغاز ہوا۔ سارہ نے ایک ایک کر کے سب کے بال کاٹے، نہلایا، نئے کپڑے پہنائے، کھانا کھلایا اور کاپی کتابیں مہیا کیں کہ وہ کچھ سیکھیں۔

چھوٹی صدف کے ایک ہاتھ میں کوئی الرجک ری ایکشن ہوا تھا اور پورا ہاتھ گل رہا تھا، ننھے زبیر کی کمر پر گھوڑے والے چابک کے نشان تھے، سات سالہ شعیب کا ایک ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا جو بس کنڈیکٹر نے بس کی صفائی ٹھیک سے نہ کرنے پر ہتھوڑا مار کے توڑ دیا تھا۔

9 سالہ عاصم کے ہاتھ جوتے پالش کر کر کے کالے ہو گئے تھے، 5 سالہ اکبر کے کپڑوں میں لوہے کی ویلڈنگ مشین سے اتنے سوراخ ہو چکے تھے جتنے آسمان پر تارے۔ 3 سالہ زینب ابھی تک بول نہ سکتی تھی یا شاید اس عمر میں وہ کچھ دیکھ لیا تھا کہ ہمیشہ کو چپ لگ گئی تھی۔

10 سالہ زُلیخا کے جسم پر نہلاتے ہوئے سارہ کا ہاتھ پڑا تو اس نے چیخ ماری اور تھر تھر کانپنے لگی۔ کلی کے سے جسم پر اتنے نشان تھے کہ جیسے جانوروں نے اُسے بھنبوڑ ڈالا ہو۔ 13 سالہ علیشاہ کا گریبان ہمیشہ پھٹا رہتا۔ یہ ان کاروالوں کی نشانی تھا جن کی کاروں کو وہ ٹریفک سگنل پر دھویا کرتی۔

8 سالہ ثاقب کچرا اُٹھاتے اُٹھاتے چرسیوں کی ہوس کا نشانہ بن چکا تھا، وہ بار بار کہتا، نہ سارہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

باجی نہ، صابن نہ لگانا، مرچی لگتی ہے، درد ہوتا ہے۔ سارہ سوچنے لگی کے جیسے ایک گاؤں مل کر ایک بچے کو پالتا ہے، اسی طرح ایک بچے کے استحصال کی ذمہ داری بھی پورے گاؤں پر ہی آتی ہے۔

جوں جوں دن گزرتا گیا، سارہ کا اپنا وجود چھنی ہوتا چلا گیا، 3 سالہ زینب اس کی گود میں پہاڑ کا سا وزن رکھتی تھی۔ جانے کیسے لوگ ہیں کہ زندگی نکال کر زندہ رہنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

سارہ نے بمشکل تمام سب کو رخصت کیا اس وعدے کے ساتھ کہ اگلے اتوار کو پھر ملیں گے۔

بچوں کے جانے کے بعد اسٹاف منیجر نے فنڈ ز ختم ہو جانے کی نوید سنائی۔

سارہ جگہ جگہ جاتی رہی مگر کچھ ہی دنوں بعد سی ڈی اے نے آفس سیل کر دیا کہ کروڑ پتی پڑوسیوں کو اِن غلیظ و ناپاک بچوں کا اپنے محلے میں آنا پسند نہیں تھا۔ اِسی ہفتے ملک کے وزیر اعظم کی بیٹی کو اقوام متحدہ میں اِسٹریٹ چلڈرن کا سفیر مقرر کر دیا گیا۔ اخبار میں ان کی تصویروں کے ساتھ ایک سہما ہوا بچہ کھڑا تھا، چپ چاپ، خاموش، ڈرا ہوا، بھوکا اور خوفزدہ۔

آج سنڈے تھا، آج کوئی بس کسی کو لے کر نہ آئی، سارہ آسمان کے نیچے بیٹھی۔ صرف آسمان کو تکے جا رہی تھی، اِس نے دعا کو ہاتھ اُٹھائے۔

''یا ذوالجلال والاکرام، یا اللہ، یارب، اِن ٹوٹے ہوئے، مظلوم و مقہور، ناجائز و ناپاک، گندے اور غلیظ بچوں کا واسطہ دیتی ہوں، ان کا واسطہ جو چپ ہو گئے، جن کی زبان، آنکھیں اور جسم داغدار ہوئے۔ جن کے چہروں سے وحشت چمٹ گئی، جن کی ہڈیاں توڑ دی گئیں، جن کے بچپن چھین لئے گئے، جن کو گناہوں کا تختہ مشق بنا لیا گیا۔ انت مولانا، تو تو ہمارا رب ہے۔ تو پیسے دے، تو رتبہ دے تو کوئی اِدارہ بنا سکوں۔ میں آج امریکہ جاتی ہوں کہ کچھ پیسے کما سکوں۔ تو پیچھے خیال رکھنا اور شمار رکھنا کہ کتنی زینب چپ ہو گئیں، کتنے ثاقب زخمی ہوئے، کتنے گریبان چاک ہوئے، کتنے سوراخ کپڑوں سے نکل کر جسموں میں چھید کر گئے۔ تیرے سہارے گلی کے بچے جنہیں کوٹھیوں نے وجود بخشا۔ تیرے حوالے اُمت کی بیٹیاں جن کی حیاء بیچ دی گئی۔ تیرے ذِمہ وہ کلیاں جنہیں مسل دیا گیا۔ میں واپس آؤں گی، مجھے تیری ذات کی قسم، تجھے تیری حیاء کا واسطہ میری مدد کر، مجھے تنہا نہ چھوڑنا! آمین''

اگلے ماہ سارہ کی تصویر پاکستانی اخبار میں چھپی۔ برین ڈرین کے عنوان کے تحت ان لوگوں میں جو پیسے کی لالچ میں امریکہ چلے گئے۔

گلی نمبر 5 میں آج بھی یہ بچے صبح لائن بنا کر گاتے ہیں۔

پاک سرزمین شاد باد!

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گناہ

جتنا ذکر ہمارے معاشرے میں گناہوں کا ہوتا ہے اتنا اگر نیکیوں کا ہو جاتا تو شاید سارے مسائل خود ہی ختم ہو جاتے۔ لوگ گناہوں کی قسمیں، گناہوں کے نقصانات اور گناہوں کے طریقوں پر وہ وہ بیانات دیتے ہیں اور اتنا کچھ لکھتے ہیں کہ ایک عام آدمی بھی چلتا پھرتا گناہوں کا انسائیکلو پیڈیا بن جاتا ہے۔

یہ بھی گناہ، وہ بھی گناہ، بولنا بھی گناہ، چپ رہنا بھی گناہ، رکنا بھی گناہ، چلنا بھی گناہ، مانگنا بھی گناہ، دینا بھی گناہ، فارغ بیٹھنا بھی گناہ، بزنس کرنا بھی گناہ، گناہ کی اس تکرار سے آدمی مایوس و پریشان ہو جاتا ہے کہ آخر جائے کہاں اور کرے کیا؟

دنیا کی جنگوں کی طرح، خیر و شر کی اس لڑائی میں بھی کوئی ری ٹریٹ ہونی چاہئیے کہ آدمی دو چار دن بیٹھ کر سکھ کا سانس لے سکے اور آرام سے سوچ سکے کہ زندگی کس ڈگر پر چل رہی ہے۔ گناہوں کے وہ وہ تذکرے اور ایسی پریشانی جو مایوسی کو جنم دے خود شیطان کی ایک چال ہے کہ بندہ کہے خدا (نعوذ باللہ) میرے گناہ بڑھ گئے اور تیری رحمت کم پڑ گئی۔ شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ بندہ اس مالک سے ہی مایوس ہو جائے جس کی کتاب شروع ہی الحمداللہ سے ہوتی ہے جو رحمٰن ہے جو رحیم ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ گناہ پر پریشانی تب تک ہو جب تک ہو نہ جائے۔ ایک بار ہو جائے تو بس اب معافی مانگے، استغفار کرے اور آگے چلے کہ زندگی پڑی ہے۔

یہ گناہ بھی اللہ سے ایک تعلق ہی تو ہے، بندہ اسی کا تو گناہ کرتا ہے کسی اور کا تو نہیں۔ اللہ نے جہاں کسی کو کوئی برگزیدہ مقام دیا ہے وہاں کسی کو کہیں اور رکھ چھوڑا ہے، خدا کے کاموں میں عِلّت نہیں ڈھونڈنی چاہئے۔ اللہ کا فضل کسی دلیل، کسی وجہ کا محتاج نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی طرح اپنا حصّہ ڈال ہی رہا ہوتا ہے۔ میچ کے اس کھلاڑی کی طرح جس کے ہاتھ میں میچ کی آخری گیند پر لگنے والا چھکّا کیچ کی صورت میں آ جاتا ہے اور وہ سُرخرو ہو جاتا ہے۔

وہ نیکی جو دعویٰ پیدا کرے اس سے وہ گناہ بہت بہتر ہے جو توڑ کر رکھ دے۔ گناہ بھی اللہ کی نعمت ہوتے ہیں یہ بندے کو بندہ بنا کر رکھتے ہیں ورنہ بندہ اوتار ہو جائے۔ اور کیا پتہ پُرسکون دل والوں کی تہجّد سے ندامت میں تڑپنے والوں کی راتیں بہتر ہوں۔

گناہ کی خواہش کا ہونا بھی بڑی اچھی بات ہے۔ یہ اُپلے ہوتے ہیں۔ گندگی ہوتی ہے۔ اسے اللہ کے خوف کی یاد میں جلانا چاہئیے کہ ترقّی ہو۔ گناہ سرکش گھوڑے ہوتے ہیں انہیں سدھانا چاہئے کہ بندہ آگے کا سفر کر سکے۔ آدمی کو ہر وقت استغفار کرتے رہنا چاہئے، یہ اللہ تک پہنچنے کا بڑا آسان راستہ ہے۔

بندہ جب گناہ کا ارادہ کر لیتا ہے تو فرشتوں کو پتہ چل جاتا ہے۔ علم بھی گناہوں سے بچاتا ہے۔ یہ نیکیوں کا ملٹی پلایئر ہے۔ اللہ گناہ کو کم درجے کا لکھتا ہے اور نیکی کو بڑھا کر لکھتا ہے۔ گناہوں کے سائیڈ ایفیکٹس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دعا سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ آدمی گناہ پر قدرت رکھتا ہو مگر چھوڑ دے کہ نفس کی مخالفت ہو، اللہ سے حیا آئے، اللہ کی محبت، خوف یا شکر غالب آ جائے تو بھی نیکی لکھی جاتی ہے۔ اللہ اپنے ادب کا مزہ ضرور چکھاتے ہیں۔ کسی کو ارادوں کی خبر ہو نہ ہو اللہ تو سب دیکھتا ہے اللہ تو سب جانتا ہے۔

اور یہ کبیرہ صغیرہ کی تکرار بھی ایک حد تک ٹھیک ہے۔ نظم و ضبط کے لئے مفتی کو فتویٰ دینا ہی پڑتا ہے مگر یوں بھی ہوتا ہے کہ ہر شخص کی پرکھ الگ ہوتی ہے۔ کسی کا صغیرہ کسی کا کبیرہ، کسی کا کبیرہ کسی کا صغیرہ۔ ہوسکتا ہے کہ شرک کا خیال کسی کے قریب سے بھی نہ گزرتا ہو مگر حسد اسے چمٹ گیا ہو۔ کسی کے لئے نماز پڑھنا آسان ہو مگر شہوت اسکا پیچھا ہی نہ چھوڑے۔ اب اگر وہ اس طلب سے نکل گیا تو اونچا گیا اور پھسل گیا تو بہت نیچے گرا۔ ہمارے معاشرے میں تو فتویٰ بھی وہ دیتے ہیں جنہیں گناہ کی الف، ب بھی نہیں آتی اور اصل فیصلہ تو حشر میں ہوگا جسے خدائے پاک نے کبیرہ کہہ دیا سو ہوا اور جسے صغیرہ تو وہ ویسا ہی لکھا جائے گا اور وہ اگر کبیرہ بھی بخش دے، بغیر توبہ کے ہی معاف کر دے، تو کون ہے جو اس کا ہاتھ روک لے۔

گناہگاروں کا بڑا احترام کرنا چاہئے۔ ان کا اللہ سے بڑا تعلق ہوتا ہے۔ ندامت کا اور توبہ کا، کسی کا بددعائیں دینے سے بیڑہ غرق نہیں ہوتا۔ اللہ کو اپنی مخلوق سے بڑا تعلق ہے اور گناہ معاف ہونے کے بھی سینکڑوں طریقے ہیں۔ گناہ نیکی سے بھی معاف ہو جاتے ہیں اور کچھ کے گناہوں کو اللہ حشر میں نیکی سے بدل دیں گے۔ اور اللہ کا فضل تو توبہ کا بھی محتاج نہیں، بغیر توبہ کے ہی بخش

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دے۔اُس سے کس نے پوچھنا ہے۔اللہ سائیں کہتے ہیں کہ وہ عذاب نہیں دیں گے، اگر ہم شکر ادا کرتے رہیں اور ایمان لائیں۔اب بتایئے، توبہ اور گناہوں کا تو نام ہی نہیں آیا۔

اُمید اور حوصلہ رکھیں۔ جب نفس گناہ کا بولے تو نہ کریں، نیکی سے روکے تو کر لیں، اتنی سی بات ہے۔

آیئے اللہ سے اپنے گناہوں کا ہی واسطہ دے کر دعا کرتے ہیں کہ نیکیاں ہیں کوئی نہیں۔کہ اے اللہ ہمیں ہمارے گناہوں کے صدقے معاف کر دے، نادانی میں ہو گئے تو بخش دے۔اے اللہ تو ہی وہ ذات ہے جو ہمارے نفس کے بیچ میں حائل ہے۔اللہ گناہوں کی لذّت ختم کر دے۔ ایسے معاف کر جیسے شہنشاہ معاف کرتے ہیں۔جس طرح تُو نے دنیا میں میرے گناہوں کی خبر نشر نہ کی اسی طرح آخرت میں بھی رسوا نہ کریو، اے اللہ، اتنا قریب بُلا لے کہ کوئی ترجمان کوئی پردہ نہ رہے۔تو گناہ بھی مٹا دے، گواہی دینے والوں کے ذہنوں سے بھی مٹا دے۔اے اللہ ہم تو گناہ کو انجوائے بھی نہ کر سکے کہ گناہوں سے پہلے بھی تیرا خیال، گناہ کے بیچ میں بھی تیرا ڈر اور گناہ کے بعد بھی تیرا خوف۔اے اللہ! ہمارے ٹوٹے ہوئے بے لطف گناہوں کے صدقے ہمیں معاف کر دے۔آمین

☆.....☆.....☆

Mentor

آج کل مینٹرز رکھنے اور بننے کا شوق اپنے عروج پر ہے، ہر طالب علم چاہتا ہے کہ کوئی دس بارہ آدمی اس کی زندگی میں ایسے ہوں جنہیں وہ فخریہ طور پر اپنا مینٹر بتا سکے اور لوگوں پر رعب جھاڑ سکے کہ اتنے بڑے بڑے لوگ اس کے مینٹرز ہیں، چاہے وہ مینٹرز حضرات زندگی میں کبھی اس کے لیے پندرہ منٹ کا وقت تک نہ نکال سکیں، چلیں طالب علموں اور کچّی عمروں کے بچوں کا یہ شوق و ذوق تو سمجھ میں آتا ہے مگر جو دوسری قسم پروان چڑھ رہی ہے جسے مینٹر بننے کا شوق ہے اُس سے اللہ بچائے۔

لاحول ولاقوۃ، عمر میں اتنے سال نہیں جتنے طالب علموں کے مینٹر بننے کی ذمّہ داری لے رکھی ہے، گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے، آدمی کی ترقّی و عروج کی جب موت آئی ہو تو اسے مینٹرنگ کا شوق چڑھ جاتا ہے۔انسانی اخلاق میں رذیل ترین صفت کسی کا مینٹر بننے کا شوق ہے۔

آپ نے زندگی میں کبھی لاکھ روپے نہیں کمائے بزنس سے اور آپ بیس سے زائد اسٹارٹ اپس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں ہیں، آپ کی داڑھی نکلے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اور آپ لوگوں کو اللہ سے ملوانے کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں، آپ کو گناہ کی الف ب بھی نہیں پتہ اور اعلان اس بات کا کہ گناہوں سے بچے ہوئے ہیں۔صالح بننے سے پہلے مصلح بننے کا شوق ایسے ہی ہے کہ کوئی شخص بیٹا بننے سے پہلے باپ بننا چاہے اور کسی کو مینٹر بنانے کے بھی آداب ہوتے ہیں، یہ نہیں کہ ملاقات پر درجنوں سوال پوچھ لیں اور دو دن بعد جواب تو درکنار سوال تک یاد نہ ہوں کہ وہ کیا پوچھے تھے۔

مینٹر ایک اچھا استاد ہوتا ہے، جس کو آپ کی زندگی، سوچ، ذہنی تغیّرات کا پتہ ہوتا ہے اور وہ آپ کی سچوئیشن کو دیکھتے ہوئے، اپنے علم، تجربے اور اللہ سے دعا کی بنیاد پر آپ کو کچھ مشورہ دے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دیتا ہے، جو علم بغیر ذکر کے پروان چڑھا وہ بھی اندھیرا ہے اور جو ذکر بغیر علم کے فروغ پایا وہ بھی۔

ایک اچھا استاد نلکے کی مانند ہوتا ہے، مثال کے طور پر شدید گرمی میں، تپتی دھوپ میں آپ ایک نلکا کھولیں اور ٹھنڈا پانی پینے کو میسّر آجائے تو آپ کے دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ بھلا کرے، اگر نلکے کی زبان ہوتی تو آپ کا شکریہ ادا کرتی کہ آپ نے اس گرمی میں اسے کھولا، ورنہ وہ یونہی تپتا رہتا، حتیٰ کہ کائی جم جاتی اور کاٹ کر پھینک دیا جاتا، وہ تو آپ کی برکت سے اس میں سے بھی کوئی پانی گزر گیا۔

اسی طرح ہر طالب علم اپنا رزق لے کر آتا ہے، یہ اس کی طلب ہے جو پانی کھینچتی ہے ٹنکی میں سے، نلکے کو اتارنا نہیں چاہئے، اگر مانگنے والے ہاتھ نہ رہیں تو دینے والے کا مصرف نہیں بچتا۔ بس اللہ سے مانگتا رہے، جیسے پیٹرول، پیسہ خرچ ہو جاتا ہے اسی طرح روحانیّت بھی خرچ ہو جایا کرتی ہے۔ آپ لوگوں سے ملتے ہیں تو وہ آپ کو کنزیوم کر لیتے ہیں، بندے کو چاہیے کہ رات کی تنہائی میں اپنے رب سے کنیکٹ ہو کر چارج ہو جایا کرے۔

کسی شخص کو میںٹر بنانے سے پہلے ان باتوں کا خیال رکھ لیں:۔

۱۔ تربیّت کہاں سے ہوئی ہے؟ اس کے پیچھے کون سا ٹیچر ہے؟ خود سے اس فیلڈ میں پختگی نہیں آتی، پڑھا کہاں سے ہے، شاہ ولیؒ اللہؒ کہتے ہیں کہ دلّی کے مردوں کا فیض، دلّی کے زندوں سے زیادہ ہے مگر کیا کریں تربیّت کے لیئے زندوں سے کنیکٹ ہونا ہی پڑتا ہے۔

۲۔ تقویٰ اور ذکر سے واسطہ ہو۔

۳۔ علم دوست آدمی ہو، کتابیں پڑھتا ہو، آس پاس میں موجود معاشرے کا اِدراک ہو۔

ایسے لوگ اب نایاب ہو گئے ہیں، تلاش جاری رکھیں۔ باقی بچے آپ اور میں تو ہمیں تو میںٹر زبننے سے یونہی ڈرنا چاہیے جیسے بکری بھیڑیے سے

☆.....☆.....☆

امریکہ

ملک کا غدّار ہے امریکہ کا جو یار ہے، ہائے ہائے امریکہ، بائے بائے امریکہ۔ اور اس جیسے کتنے ہی نعرے سن کر میں جوان ہوا۔ افغانستان جنگ کے بعد تو گویا آگ ہی لگ گئی، امریکہ کی ہر چیز سے دشمنی، نام سے، جھنڈے سے، اعمال سے، تقریروں سے۔ اگر بس چلے تو شاید حروفِ تہجی سے وہ حروف ہی نکال دیں جن سے امریکہ بنتا ہو۔ ملک عزیز میں ہونے والی ہر بری چیز کے پیچھے امریکہ اور اسرائیل کی سازش۔ حُبّ الوطنی کا ثبوت پیش کرنا ہو تو امریکہ اور امریکیوں کو گالی دے دیں، گویا آسمان سے گواہی آگئی کہ آپ اور آپ کی لال ٹوپی حُبّ الوطنی کی واحد ضامن ہیں۔

ڈاکٹر عافیہ صدیقی، ریمنڈ ڈیوِس اور تابوت میں آخری کیل ملالہ یوسف زئی، امریکہ کا نام لینا بھی گالی بن گیا اور کسی نے اگر امریکہ وزٹ بھی کر لیا تو گویا شرابی، زانی اور ملحد و کافر تو ہوا ہی، ساتھ میں سی آئی اے کا ایجنٹ بھی ہو گیا۔ اب آسمان سے وحی آئے تو خلاصی ہو ورنہ جس نے جہاں جو کہہ دیا وہ مرتے دم تک آپ کے نصیب پر کالک ملتا رہے گا۔

''اِخلاق باختگی اور فحاشی کے گہوارے'' میں جب میں پڑھنے آیا تو بلا مبالغہ سینکڑوں ایسی چیزیں دیکھنے کو ملیں جن کے بارے میں ہمارے ملک میں جھوٹ کہا جاتا ہے، اخلاق اور ان کو قانونی شکل دے دینا، انسانیّت اور عزّتِ نفس کی رکھوالی صرف انہی دو کی مثال لے لیں تو امریکہ دنیا بھر میں ممتاز ٹھہرے۔ میں اس بات سے بحث نہیں کر رہا کہ کون صحیح، کون غلط۔ کس نے کب کب کیا کیا؟ اور کس نے پیٹھ میں چُھرا گھونپا۔

میں تو صرف اپنے گریبان میں جھانکنے کا کہتا ہوں۔ دنیا میں دو اصول ہمیشہ سے کارِ بند دیکھے ''منزل علم و ہمّت کی محتاج ہے'' اور ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس''۔

آج امریکہ بلا شرکت غیرے سائنس اور فنونِ لطیفہ میں سرِ فہرست ہے۔ یہاں کی یونیورسٹیاں دنیا بھر کے اہلِ علم کی پیاس بجھاتی ہیں۔ یہاں کے سائنسدانوں کی ایجادات پوری دنیا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کو نفع دیتی ہیں۔خواہ وہ کوئی نئی ویکسین ہو یا خلائی سیّارہ، زراعت ہو یا ڈی این اے کا نقشہ اور انگریزی زبان علم وثقافت میں اوّل نمبر پر آتی ہے۔تو آخر ایسا کیوں کر ممکن ہو کہ ہم امریکہ اور انگریزی کا بائیکاٹ کر دیں اور دنیا میں آگے بڑھ سکیں؟

تنقید کا حق ضرور رکھیئے، برائیوں پر بات بھی کریں مگر جو اچھائیاں ہیں، جو تعریف کا حق ہے، جو شکر واحسان کی سنَد ہے اُسے بھی تو قبول کریں۔مگر ہمیں تاریخ کے دستر خوان پہ حرام خوری سے فرصت ملے تو عملی اور علمی دنیا میں کچھ کریں نا!

بھائی، دنیا اسباب سے چلتی ہے، حضرت مریمؑ کو کھجوروں کے لئے درخت ہلانا پڑا تھا، حضرت مسیحؑ دمشق میں مسجد کے بارہ فٹ اونچے مینار سے سیڑھی کے ذریعے نیچے اتریں گے اور اگر کل سائبر وار چھڑ گئی تو اذانیں دینے سے انٹرنیٹ پروٹوکول تبدیل نہیں ہو جائیں گے۔آج دنیا کے نوجوانوں کا دھارا جو امریکہ کی طرف بہہ رہا ہے ایسا تو خود ہماری اپنی تاریخ سے ثابت ہے۔

عربی کم وبیش کوئی سات سو سالوں تک دنیا میں علم کی علمبردار رہی، آٹھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک، مسلمانوں کا علوم وفنون میں طوطی بولتا تھا۔عبّاسی خلیفہ ہارون الرّشید کے دور میں بغداد میں ''ہاؤس آف وزڈم'' کے نام سے دنیا کا سب سے بڑا ٹرانسلیشن کا ادارہ بنا جہاں ہزاروں لوگ دنیا بھر کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرتے تھے، فیز، مورو کو میں قائم جامعتہ القروین 859 عیسوی میں قائم ہونے والی دنیا کی پہلی باضابطہ یونیورسٹی ہے۔(یونیسکو، گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ). ابنِ خُلدون یہیں کے تو پڑھے ہوئے تھے۔اس سے پہلے بھی تیونس میں زیتونہ مسجد کے نام سے 703 عیسوی میں مدارس کی بنیاد پڑ چکی تھی۔

اُس دور میں جو مقام عربی کو حاصل تھا وہ آج انگریزی کو ہے۔اُس دور میں جو مقام بغداد، بخارا، قسطنطنیہ اور اُندلس کو حاصل تھا وہ آج سان فرانسسکو، نیو یارک، لندن اور پیرس کو حاصل ہے۔

دنیا نے تو عربی اور بغداد کا بائیکاٹ نہیں کیا تھا، نہ ہی بغدادی سازشوں پر کوئی ڈرامے اور ناولز لکھے گئے اور نہ ہی عربی پڑھنا عیسائیت اور یہودیت کی تباہی قرار پایا۔تو آج اگر وقت کا پہیہ الٹ گیا ہے تو سمجھداری یہی ہے کہ علم وہمّت کو اپنی کھوئی ہوئی میراث سمجھیں اور محنت کریں اور جذبات سے بلند ہو کر سوچیں۔

دوسرا اصول لاٹھی اور بھینس۔آج اگر امریکہ آ کے، ریمنڈ ڈیوس کو چھڑا کر لے گیا تو یہ بھی دنیا

کے قوانین کے عین مطابق ہے۔جو حکمران ہوتا ہے اسی کا کہا قانون کہلاتا ہے۔چلیں میں دور کی بات نہیں کرتا۔

1695 کا زمانہ ہے اورنگزیب عالمگیر کی حکومت ہے۔انڈیا سے گنجِ سوائی نام کا ایک بحری بیڑہ حج کے لیئے روانہ ہوتا ہے۔باب المندب کے مقام پر، سورت سے کچھ دور اُسے فینسی نامی بحری قذّاق اور اُس کے ساتھیوں نے لوٹ لیا اور اُس کے کمانڈر فتح محمّد کو یرغمال بنا لیا۔اورنگزیب عالمگیر کا عتّاب برِٹش ایمپائر پر نازل ہوا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے آفیسز جلا دیئے گئے، برطانوی شہریوں کو زدوکوب کیا گیا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہیڈ سر جون گیئر کو معافی نامہ پیش کرنا پڑا اور اورنگزیب کے وزیروں سدی یعقوب، نواب داؤد خان اور اسد خان کے سامنے تاجِ برطانیہ کو ناک رگڑنی پڑی اور فی مسافر اس دور میں (کوئی سوا چار سو سال پہلے) ایک ہزار پاؤنڈ کا جرمانہ بھی بھرنا پڑا۔دنیا کی تاریخ کا سب سے بڑا مین ہنٹ بھی شروع ہوا ان قزاقوں کو پکڑنے کے لئے۔

تو حضورِ والا، جب آپ کی لاٹھی تھی تو آپ کی چلتی تھی۔اب لاٹھی ہاتھ میں نہیں ہے تو بھینس کا ماتم کیوں کرتے ہو؟

آیئے، آپ اور میں مل کر عہد کرتے ہیں کہ پڑھیں گے، اخلاق سیکھیں گے اور اپنے ملک کو امریکہ سے بھی اعلیٰ بنا دیں گے۔

اور اگر ہمیشہ کی طرح اختلاف ہی کرنا ہے اور گالیوں سے ہی نوازنا ہے تو میں نے ایک عدد ای میل صرف گالیوں کے لئے ہی مختص کر دیا ہے۔نوٹ فرمالیں

insultreceiver@gmail.com

جسے میں ہفتے میں ایک بار ضرور دیکھتا ہوں۔

اللہ نگہبان

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اِنسان

نئے سال کی شروعات کے ساتھ ہی نیوائیر ریزولوشن کا طوفان اُمڈ آیا، کوئی چاہتا ہے کہ وہ اِس سال بیس کلوگرام وزن کم کر دے، تو کسی کو شادی کی تمنا، کسی کو بزنس کا جنون، تو کسی کو نوکری کی تلاش۔ ایک سے بڑھ کو ایک مفروضے، نت نئی کہاوتیں، عجیب وغریب امثال اور ذہین وفطین افکار۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ہم ایک اچھا اِنسان بننے کا بھی تہیہ کر لیں۔ کوئی ایسا ادارہ بھی ہو جہاں اِنسان بنائے جائیں اور مخلوقِ خدا کی تربیت پر کام ہو۔ کتنی سیدھی سادھی سی نیوائیر ریزولوشن ہو۔

عقل، غصہ اور شہوت (جنس) وہ تین جبلتیں ہیں جو جانداروں میں پائی جاتی ہیں۔ نباتات اور پودوں میں جنس ہوتی ہے مگر عقل اور غصہ نہیں۔ جانوروں میں غصّہ ہوتا ہے اور شہوت بھی مگر عقل نہیں۔ فرشتوں میں عقل ہوتی ہے مگر غصہ اور شہوت نہیں۔ اِنسان و جن میں عقل، غصہ اور شہوت تینوں ہوتی ہیں۔ ان تینوں کو اعتدال پہ رکھنے کا نام اِنسانیت ہے۔

یہ اعتدال یوں تو آسان لگتا ہے۔ ہر آدمی دعوی کرتا ہے کہ جناب غصہ تو آتا ہی نہیں ہے، جنس پر مکمل کنٹرول ہے اور عقل بھی دیکھ کے اِستعمال کرتے ہیں مگر حقیقت میں اِن کی آفتوں سے بچنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اگر کوئی شخص زندگی بھر کام کرتا رہے اور مرتے دم تک اِسی فکر میں لگا رہے تو شاید کچھ بہتری کی اُمید ہو۔ جس نے سمجھ لیا کہ وہ اِس اعتدال میں کامیاب ہو گیا وہ تو ہلاک ہوا۔

عقل کی خرمستیاں تو منہ چڑھ کر بولتی ہیں۔ بڑے بوڑھے کہتے تھے کہ جب دلیل اور بندہ آمنے سامنے ہوں تو دلیل مار دو بندہ بچا لو۔ مگر آج اِسی عقل اور دلیلوں کو لوگوں کی گردنیں اُتارنے پر استعمال کرتے ہیں۔ کوئی آپ سے چبھتا ہوا سوال پوچھ لے، کوئی سوشل میڈیا پر کوئی بحث چھیڑ دے، کوئی بڑا یا اُستاد کوئی ایسی بات کر بیٹھے جو آپ جناب کے مزاج سے موافق نہ ہو، کوئی ساتھ کام کرنے والا آپ سے آگے بڑھ جائے، کسی رشتے دار کے بچے آپ کے بچوں پہ فوقیت لے جائیں، یا کوئی پڑوسی آپ سے اچھا مکان بنا لے یا گاڑی لے آئے، پھر دیکھیں اس عقل کے کرشمے۔ جب تک کمائے ہوئے مال کو حرام، کئے گئے اعمال کو کفر، اور پائی گئی شہرت کو ذلت میں

ثابت نہ کر دیں یہ عقل خاموش نہیں ہو پاتی۔ کسی شخص کی ترقی و کامیابی کو نہ ماننا بھی تکبر کی نشانی ہے اور تکبر عقل پر پلتا ہے۔ آپ دماغ چلانا بند کر دیں تو یہ بھوکا مر جائے کہ اِسکو غذا کی شکل میں اِنفارمیشن ہی نہ ملے۔

غصّے کو اعتدال پہ رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ آدمی کو خلافِ مزاج بات پر غصّہ آتا ہی ہے۔ کوئی ظلم دیکھے، ناانصافی کا سامنا ہو، کوئی لوٹ لے، چوری ہو جائے۔ کوشش کرنی چاہئیے کہ اِس آگ کو اچھے کاموں میں لگائے۔ غصّے سے سینک لے اور نیک کام کرے۔ اپنے بیوی بچوں، اہلِ وعیال کے معاملے میں تو ہر کوئی درگزر سے کام لیتا ہی ہے۔ پتہ تو اُس وقت چلتا ہے جب نوکر کا بچہ گلاس توڑ دے۔ سرِعام کوئی گالیاں دینا شروع کر دے اور کوئی بغیر کسی وجہ کے آپ کی بے عزتی پر تُل جائے۔ ہمارے ملک میں فرسٹریشن اِتنی زیادہ ہے کہ ہر شخص کو تختۂ مشق چاہئیے ہوتا ہے اپنا غصہ نکالنے کے لئے۔

جنس ایک بے لگام گھوڑا ہے۔ اسے سدھانا بہت مشکل ہے۔ یہ موت تک زور لگاتا رہتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ کائنات میں جنس کے سوا کچھ نہیں دکھتا۔ باقی تمام گناہ چھوٹے لگنے لگتے ہیں۔ جنس کا ذہانت کے ساتھ بھی کوئی تعلق ضرور ہے جتنا آدمی ذہنی طور پر طاقتور ہوتا ہے اتنا ہی جنسی رجحان اس میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ کڑا امتحان ہوتا ہے کہ حسن اپنے آپ کو پیش کرے، گانوں، فلموں، اِشتہاروں، اور روڈ بل بورڈز کی شکل میں آپکے سامنے جلوہ گر ہو اور آپ اپنے آپ پر قابو رکھیں اور نظریں جھکا لیں۔ میرے ایک دوست کہتے ہیں کہ یاداشت بڑھانی ہو تو آنکھوں کی حفاظت کرنی چاہئیے کہ علم کبھی گندے برتن میں نہیں آتا۔

قدرت نے جو جائز طریقے بتائے ہیں آدمی اس پر چلے۔ ان سے بھی کنارہ کشی کرے گا تو تباہ ہو جائے گا۔ جو بندہ قدرت سے ٹکرایا، قدرت نے اُسے پچھاڑ دیا۔

جب بندہ ان تینوں پر قابو پا لیتا ہے کہ اعتدال پہ رکھ سکے۔ تب وہ سلیم الفطرت بنتا ہے، تب اُسے حق ہے کہ اِنسان کہلایا جائے۔ اور کسی اُستاد کے بغیر یہ مقام ملنا بہت مشکل ہے۔ آیئے مل کر کوشش کریں۔ اِنسانیت کو اِنسانوں کی ضرورت ہے۔

☆.....☆.....☆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"من الربّک"

تمہارا رب کون ہے؟ یہ ایک سوال ہے جو ہر اِنسان و جن سے کم از کم ایک بار ضرور ہوگا۔ سوچنا چاہئیے کہ ربّ کا مطلب کیا ہے اور یہ سوال صِفتِ ربّ کے ساتھ ہی کیوں مخصوص ہے؟ ایسا کیوں نہیں کہ پوچھا جائے تمہارا اللہ کون ہے یا تمہارا خالق کون ہے یا مالک کون ہے؟

غور کیا جائے تو کائنات میں اِلٰھیہ کا سوال تو کبھی رہا ہی نہیں ہر ایک کم و بیش ایک سپریم طاقت پر یقین رکھتا ہے۔ مشرکینِ مکہ کہتے تھے کہ یہ بت ہیں جو ہمیں رزق، اولاد اور بارش دیتے ہیں، مصیبتوں سے بچاتے ہیں۔ ہندو کہتے ہیں فلاں فلاں بت ہمیں فلاں فلاں چیزیں دیتے ہیں اور خدا کے اوتار ہیں۔

مسئلہ تو ربوبیت کا ہے کہ کون ہے جو اسبابِ زندگی مہیا کرتا ہے؟ کون ہے جو پالنہار ہے، کون ہے جو مصیبتوں میں بچاتا ہے، کون ہے جو بیڑہ پار لگاتا ہے، کون ہے جو پُکار سنتا ہے، کون ہے جو مراد بَر لاتا ہے، کون ہے جو رزق دیتا ہے، کون ہے جو گنہگاروں کو بخش دیتا ہے، کون ہے جو اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے، کون ہے جو راتوں کو تڑپنے والوں کی سنتا ہے اور کون ہے جو زندگی کو زندگی بخشتا ہے؟

یہاں جا کے ہم مار کھاتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ کچھ لوگوں کے لئے اُن کا ربّ ان کی عقل ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم سیلف میڈ ہیں سب کچھ اپنی عقل سے کمایا اور اِس مقام تک پہنچے۔ کسی کے لئے اُن کا ربّ ان کی زبان، کہ جب چاہا جیسے چاہا سچ کو جھوٹ، جھوٹ کو سچ کر دکھایا اور دنیا سے خوب داد اور پیسہ کمایا۔ کسی کے لئے اُن کا ربّ ان کی اعلیٰ ذات ہوتی ہے تو کسی کے لئے تعلقات، کسی کے اثر و رسوخ، کسی کی دولت، کسی کی بیوی تو کسی کی نوکری۔ زندگی گزر جاتی ہے اِن جھوٹے خُداوں کے بیچ اور جب سوال ہوتا ہے کہ من الرَ بّکَ؟ تو زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ دراصل دل و دماغ کنفیوژ ہو جاتے ہیں کہ کسے ربّ کہیں؟ انہیں جنہیں زندگی بھر پوجتے آئے تھے یا اُسے جس کا حق ہے؟

بندہ اگر اللہ سُبحانَ وتعالیٰ کو ربّ مان لے، جیسے کہ اُس کا حق ہے تو زندگی بھر کی پریشانیاں اور مایوسیاں چھٹ جاتی ہیں۔ ربّ وہ ہوتا ہے جو بندے کو درجہ بدرجہ سکھاتا رہے، منزلیں چڑھاتا رہے۔ حتیٰ کہ کامل کر دے۔

☆.....☆.....☆

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ڈِزایبلٹی

ڈِزایبلٹی کی تعریف اُس حالت سے کی جاتی ہے جس میں انسان کی سوچنے، سمجھنے، کام کرنے اور روزمرہ کے معاملات نپٹانے کی صلاحیت محدود ہو جائے۔

کوئی ہاتھ اور پیروں سے اپاہج تو کوئی ذہنی معذور، کسی کو لرننگ ڈزایبلٹی تو کسی کو بولنے، سننے یا دیکھنے میں دِقت۔ اقوامِ متحدہ سے لے کر دنیا کے تمام ممالک ایسے لوگوں کو خصوصی مراعات دینے کے حامی اور سینکڑوں ادارے اِن لوگوں کی توجہ اور بحالی کی ضامن۔

عبداللہ سوچا کرتا، کہ جسم کی طرح روح پر بھی ڈِزایبلٹی آ جاتی ہے۔ پھر وہ سوچنے، سمجھنے، پرکھنے اور متنبہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔

روح پر بھی تو فالج گر جاتا ہے اس کے بعد انسان کو اچھے برے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اُس شخص کی طرح جس کی زبان کا ذائقہ ختم ہو گیا ہو پھر مٹی اور مرغی دونوں برابر ہیں۔ اِسی طرح فالج زدہ روح نہ گناہ پر ٹوکتی ہے اور نہ ہی نیکی پر جھومتی ہے۔

عبداللہ آج نیویارک میں اندرونِ زمین بنی ٹرین (جسے سب وے کہا جاتا ہے) میں سفر کر رہا تھا۔ ٹرین کی بوگی کے کونے میں ڈِزایبل لوگوں کے لئے مخصوص سیٹیں مختص تھیں۔ عبداللہ نے اُس طرف دیکھا اور جا کے چُپ چاپ ان پر بیٹھ گیا۔ پورے سفر اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرتے رہے۔ وہ سوچتا رہا کہ اللہ سبحانہ وتعالی سے کنیکٹ ہونا، دعا مانگنا، التجاء کرنا، بھورسہ و یقین رکھنا بھی تو ایک صلاحیت ہے اور اس میں ہم سب ڈِزایبل ہو گئے ہیں۔ ان مخصوص نشستوں پر تو اُمتِ مسلمہ کو بیٹھ جانا چاہئیے۔ آج امت کو سب سے زیادہ خطرہ امتیوں سے ہی ہے۔

روح کی وہ صلاحیت جو اپنے رب سے کنیکٹ کرے اس کی محتاجی کا بھی کوئی مداوا کرے۔ کوئی ادارہ، کوئی دوا، کوئی ٹریٹی اس کے لئے بھی بنے۔

عبداللہ کی سوچ کو ایک لنگڑے شخص نے توڑا جو سیٹ کا متمنی تھا۔ وہ عبداللہ کو حیرت سے دیکھ رہا تھا

کہ وہ اِس سیٹ کا زیادہ حقدار ہے اور عبداللہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ ٹانگوں کی معذوری، روح کی معذوری سے کیسے بڑھ سکتی ہے۔

چلتے پھرتے لوگوں کی اِسی دنیا میں نادیدہ ڈِزایبلٹی کا رونا کون روئے؟

خود سے اِٹھیں تو خُدا تک پہنچیں نا! وہ ایسا کریم کہ گناہ بندہ کرے اور حیاء اس ربِّ قدیر کو آئے۔ ڈِزایبل لوگوں کی ڈِزایبلٹی کا علاج ایک سجدہ ہے جو خلوصِ نیت سے اس کی طلب میں کیا جائے جو روحوں کے فالج کو پلک جھمکنے میں ٹھیک کرنے پر قادر ہے۔

☆.....☆.....☆

اُردو کُتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT